اردو کی آٹھویں کتاب

برائے جماعت ہشتم



مستونگ
ت پبلشرز
رستم جی لین، جناح روڈ، کوئٹہ

برائے:
بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ، کوئٹہ

اُردو

برائے جماعت ہشتم



پبلشرز

قلات پبلشرز رستم جی لین، جناح روڈ، کوئٹہ
مستونگ

برائے

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ



فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان		صفحہ
۱	حمد	(نظم)	۵
۲	ایثار و تعاون		۷
۳	سلام	(نظم)	۱۲
۴	میرا روزنامچہ		۱۴
۵	قائداعظمؒ اور طلباء		۱۷
۶	شہری دفاع		۲۲
۷	نمودِ صبح	(نظم)	۲۶
۸	مولانا شبلی نعمانی		۲۷
۹	وقت کی پابندی		۳۰
۱۰	جمہوریہ انڈونیشیا		۳۴
۱۱	وہ دیس ہمارا ہے	(نظم)	۴۰
۱۲	سیّد سلیمان ندوی		۴۳
۱۳	چچا چھکن نے تصویر ٹانگی		۴۷
۱۴	اِسلامی اخوّت		۵۱
۱۵	عروجِ اسلام کا دَور	(نظم)	۵۵
۱۶	چیف جسٹس محمد رستم کیانی		۵۷
۱۷	چیچک کا ٹیکہ		۶۲
۱۸	کلیم اور ظاہر دار بیگ		۶۵
۱۹	بارش کا پہلا قطرہ	(نظم)	۷۱
۲۰	حضرت شیخ الاسلام بہاؤالدین زکریا ملتانی		۷۳
۲۱	شمسی توانائی		۷۷
۲۲	اُردو زبان و ادب (۱)		۸۰
۲۳	اُردو زبان و ادب (۲)		۸۵

صفحہ		عنوان	نمبر شمار
۸۸	(نظم)	یاں سودا دست بدستی ہے	۲۴
۹۱		سیّد امیر علی	۲۵
۹۵		صنعت ریشم سازی	۲۶
۱۰۰		دستی کام	۲۷
۱۰۶	(نظم)	نئے تقاضے	۲۸
۱۰۷		مولانا محمد رسول خان	۲۹
۱۱۲		تحریکِ پاکستان میں طلبا کا کردار	۳۰
۱۱۶		ٹیکسوں کی ادائیگی	۳۱
۱۲۱	(نظم)	ماں کا خواب	۳۲
۱۲۲		خواجہ الطاف حسین حالی	۳۳
۱۲۶		راشد مِنہاس شہید نشانِ حیدر	۳۴
۱۲۹	(نظم)	اِذنِ جہاد	۳۵
۱۳۱		حافظ کفایت حسین	۳۶
۱۳۴		اِسلامی ملکوں کے سربراہ لاہور میں	۳۷
۱۳۹		شہزادی برجیس کی کہانی	۳۸
۱۴۳	(نظم)	ہم سے وطن کا مان	۳۹
۱۴۵		ایک دِلچسپ سفر	۴۰
۱۵۰	(۱)	حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ	۴۱
۱۵۵	(۲)	حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ	۴۲
۱۶۰	(نظم)	رباعیات	۴۳
۱۶۱		واقعۂ کربلا	۴۴
۱۶۵		خطوط	۴۵
۱۷۱		آبادی کے مسائل	۴۶
۱۷۶	(نظم)	دُعا	۴۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد

پہنچتا ہے ہر اِک میکش کے آگے دورِ جام اُس کا
کِسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لُطفِ عام اُس کا

ہر اِک ذرّہ فضا کا داستاں اُس کی سُناتا ہے
ہر اِک جھونکا ہَوا کا آ کے دیتا ہے پیام اُس کا

نظام اپنا لیے پھرتا ہے کیا خُورشیدِ نُور افشاں
ہزاروں ایسی دُنیاؤں کو شامل ہے نِظام اُس کا

میں اُس کو کعبہ و بُت خانہ میں کیا ڈھُونڈنے نِکلوں
مِرے ٹُوٹے ہُوئے دِل ہی کے اندر ہے مقام اُس کا

سراپا معصیت میں ہوں، سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری، خطا پوشی ہے کام اُس کا

بُجھاتے ہی رہے پھونکوں سے کافر اُس کو رہ رہ کر
مگر نُور اپنی ساعت پر رہا ہوکر تمام اُس کا

نہ جا اُس کے تحمّل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اُس کی
ڈر اُس کی دیرگیری سے کہ ہے سخت اِنتقام اُس کا

(مولانا ظفر علی خان)

ایثار و تعاون

حامد صاحب کا گھرانا نیکی، دین داری، خدا ترسی اور خدمتِ خلق میں شہر بھر میں مشہور ہے۔ بڑے تو بہر حال بڑے ہیں، اس خاندان کے چھوٹے بچے تک انتہائی مہذب، نرم مزاج اور خوش خو ہیں، اُن کی سرشت میں گویا یہ بات داخل ہے کہ مشکل وقت میں ہر اپنے پرائے کی مدد کو دل و جان سے حاضر ہوں۔ یہ سب نتیجہ ہے حامد صاحب کی تربیت کا۔ وہ خود قرآن، حدیث اور تاریخ اسلام سے خوب واقف ہیں اور بچوں کو انہی کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے دُوسری باتوں کے علاوہ یہ طریقہ اپنا رکھا ہے کہ رات کو سونے سے پہلے تمام بچوں کو گھر کے سب سے بڑے کمرے میں اکٹھا کر لیتے ہیں۔ خاندان کے دوسرے افراد بھی وہیں آجاتے ہیں۔ بڑی بے تکلفی کے ساتھ بچوں سے ان کی دن بھر کی کارگزاریوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ لکھائی پڑھائی سے لے کر کھیل کُود تک تمام باتیں زیرِ بحث آتی ہیں۔ حامد صاحب کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی بچے کی کوئی ایسی حرکت اُن کے علم میں آئی جسے وہ ناپسندیدہ تصوّر کرتے ہوں، ہنسی ہنسی میں اُسے اس حرکت سے باز رہنے کی ہدایت کر دی۔ اِس موقع پر اُن کے لہجے میں سختی ہوتی ہے نہ ماتھے پر کوئی شکن۔ اچھے اچھے کاموں پر وہ بعض اوقات بچوں کو انعام سے بھی نواز دیتے ہیں۔ قرآن، حدیث اور تاریخِ اِسلام کی باتیں ہوتی ہیں اور اِس انداز میں کہ ہر بات دل میں اُترتی محسوس ہوتی ہے۔

آج بھی حسبِ معمول بچے اکٹھے ہوئے، حامد صاحب تشریف لائے تو سب کے سب تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حامد صاحب نے اُنھیں دعائیں دیتے ہوئے بیٹھ جانے کو کہا۔ بات چیت شروع ہوئی تو حامد صاحب نے بچوں سے دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا۔ صبح کی نماز، تلاوتِ کلامِ پاک، سکول، کھیل کُود، آپس کے ہنسی مذاق غرض سبھی موضوعات زیرِ بحث آئے۔ فہیم آج انعام کا مستحق ٹھہرا تھا کہ اُس نے مدرسے سے لوٹتے ہوئے ایک تو راستے میں پڑے ہوئے کیلے کے چھلکے اُٹھائے تھے، اس خیال سے کہ کوئی راہ چلتا ان پر پھسل کر گر سکتا تھا۔ دُوسرے ایک اندھے کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھے راستے پر لگایا تھا۔ حمیدہ اور نعیم آج ایک دوسرے سے بالکل الگ چُپ چاپ سے بیٹھے تھے، حامد صاحب پہلے ہی اُن کے تیوروں سے بھانپ گئے تھے کہ ان میں کچھ رنجش ہے۔ دوسری باتوں سے نمٹ کر انھوں نے پہلے تو حمیدہ سے پوچھا، "کیوں حمیدہ، آج تم کیوں گم صُم سی بیٹھی ہو؟" "ایسی کوئی بات نہیں اباجان، بس

یونہی طبیعت کچھ خراب سی ہے۔"

"نہیں بھئی، یہ میں خوب سمجھتا ہوں کہ ضرور کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے کہ تم آج چپ چپ سی بیٹھی ہو۔"

"میں عرض کر چکی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"خیر، ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کوئی بات ہوئی یا نہیں۔"

"ہاں بھئی نعیم، اور تم کیوں روٹھے روٹھے سے نظر آ رہے ہو؟"

"ابا جان، باجی آج مجھ سے ناراض ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"ابا جان، محض معمولی سی بات پر۔"

"آخر میں بھی تو سنوں۔"

"ابا جان، قصہ یہ ہوا کہ آج جب میں سہ پہر کو گھر لوٹا تو باجی نے مجھ سے کہا کہ دیکھو نعیم، تمہارے پاس دو قلم ہیں، میرے پاس ایک ہی قلم تھا۔ آج میز سے گر کر ٹوٹ گیا ہے۔ کیوں نہ میں تم سے ایک قلم لے لوں۔ انجانے میں میرے منہ سے نہ نکل گئی اور بس اسی پر باجی مجھ سے رُوٹھ گئیں اور جب سے میری طبیعت بھی بوجھل ہے۔"

"کیا واقعی اس کا قلم گر کر ٹوٹ گیا تھا؟"

"جی ہاں، ہوا تو ایسا ہی تھا۔"

"تو بھئی، جب تمہارے پاس دو قلم تھے تو ایک حمیدہ کو دے دیا ہوتا۔"

"جی، میں عرض کر چکا ہوں کہ بس یونہی میرے منہ سے نہ نکل گئی تھی۔"

"خیر یہ معمولی بات ہے، اس کا ازالہ ہو سکتا ہے اور ہاں، کیا بھئی، تم وہ سب باتیں بھول گئے جو تعاون و ایثار سے متعلق میں وقتاً فوقتاً تمہیں بتاتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سب کچھ تم فراموش کر چکے ہو، تو کیوں نہ آج باقی نصف گھنٹہ اسی میں صرف کیا جائے۔"

سبھی بچے چوکنا ہو گئے اور غور سے حامد صاحب کی گفتگو سُننے لگے۔ حامد صاحب نے بات یہاں سے شرُوع کی۔

"ہم سب جس کتابِ الٰہی کے احکام کو سچا اور برحق جان کر اس پر ایمان لائے ہیں، اسی میں یہ حکم بھی ہے کہ نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو اور جہاں گناہ اور زیادتی ہو وہاں تعاون سے ہاتھ کھینچ لو، اور رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشادِ گرامی بھی تمہیں یاد ہوگا کہ مسلمانوں کی مثال ایک دوسرے کی محبت اور صِلہ رحمی میں ایک بدن کی سی ہے کہ جیسے بدن کا کوئی بھی عضو تکلیف میں ہو تو تمام بدن بے چین رہتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک مسلمان تکلیف میں ہو تو تمام مسلمان اسے اپنی

تکلیف سمجھتے ہوئے بے قرار ہو جاتے ہیں۔

تعاون نیک کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کو کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس میں انسان کو ایثار سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ اور ایثار نام ہے اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینے کا۔ یہی باتیں تھیں جنھیں اپنا کر صحابہ کرامؓ نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی تھی جس میں اخوت اور محبت کی فضا میں زندگی کے تمام امور انجام پاتے تھے۔ ان بزرگ ہستیوں نے رسولِ خدا صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کے سایۂ رحمت میں تعاون و ایثار کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ آخر کوئی بات تو تھی کہ مدینے کے انصار مکےؓ کے مہاجرین کے لیے اپنا سب کچھ تج دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ نعیم تم ایک قلم کی بات کرتے ہو، یہاں تو دوسروں کے لیے مکان خالی کر دیے جاتے ہیں، اُنھیں اپنی جائدادوں میں برابر کا حصے دار بنا لیا جاتا ہے، اور یہ سب کچھ اس عالم میں ہوتا ہے کہ دل خوشی سے بلّیوں اُچھل رہے ہوتے ہیں اور چہروں پر مسرت کی شادابی اور شگفتگی کھیل رہی ہوتی ہے۔ ایسی ہی مقدّس ہستیوں کی شان میں خود خدا نے بھی فرمایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر دُوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ اُنھیں فاقے ہی کیوں نہ کرنے پڑیں۔

صحابیؓ کے چراغ گُل کرنے کا واقعہ تو تمھیں یاد ہی ہوگا۔ لو سُنو، کہ حضورؐ سراپا رحمتؐ کی خدمتِ اقدس میں ایک صحابی حاضر ہوئے اور سخت بُھوک کی اِطلاع دی۔ حضورؐ نے اپنے گھروں میں آدمی بھیج کر معلوم کرایا تو پتہ چلا کہ وہاں بھی کھانے کو کچھ نہیں۔ آخر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص ایک رات کے لیے ان کی میزبانی قبول کرنے کو تیار ہے؟ ایک انصاری صحابیؓ اُٹھ کھڑے ہُوئے اور دست بستہ عرض کیا کہ حضورؐ میں اِنھیں اپنے ہاں لے جاؤں گا۔ جب مہمان کے ساتھ گھر پہنچے تو بیوی سے کہا کہ یہ حضور اکرمؐ کے مہمان ہیں۔ اِن کی خاطر مدارات میں کسی قِسم کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ بیوی نے قسم کھا کر کہا کہ بچّوں کے لیے تھوڑا سا کھانا گھر میں موجود ہے اس کے علاوہ اور کچُھ نہیں۔ صحابیؓ نے فرمایا کہ بچّوں کو بہلا کر کسی طرح سُلا دو۔ اس کے بعد کھانا لے کر مہمان کے ساتھ بیٹھ جائیں گے۔ اسی اثنا میں تم بتّی درست کرنے کے بہانے چراغ گُل کر دو اور اس وقت تک بجھائے رکھو جب تک مہمان کھانے سے فارغ نہ ہو جائے۔ یوں وہ رات میاں، بیوی اور بچّوں نے فاقے سے بسر کی، لیکن مہمان کو کھانا ضرور کھلایا۔

اور ہاں وہ یرموک کا واقعہ، مجھے اُمید ہے کہ تمھیں ضرور یاد ہوگا۔

عین میدانِ جنگ میں تین زخمی پڑے زندگی کی آخری سانسیں گِن رہے ہیں۔ ایک تو زخموں سے چُور چُور ہیں دوسرے پیاس کی شدّت نے اُنھیں بے حال کر رکھا ہے۔ اتنے

میں ایک صحابیؓ پانی کا مشکیزہ لیے آ پہنچتے ہیں، جب پہلے زخمی کو پانی پلانے پہنچتے ہیں تو وہ دُوسرے کی طرف اشارہ کر دیتا ہے، جب دوسرے کے پاس جاتے ہیں تو وہ اپنی پیاس کی پروا کیے بغیر تیسرے کی جانب اشارہ کر دیتا ہے اور جب تیسرے زخمی کی نوبت آتی ہے تو وہ اُس وقت تک دم توڑ چکا ہوتا ہے۔ یہ جھٹ سے دوسرے زخمی کے پاس آتے ہیں لیکن وہ بھی جاں بحق ہو جاتا ہے، لپک کر جب یہ پہلے زخمی کے پاس پہنچتے ہیں تو وہ بھی جامِ شہادت نوش کر چکا ہوتا ہے۔ تو دیکھا تم نے کیا ایثار کی اس سے بڑھ کر اور کوئی مثال مِل سکتی ہے؟

ہاں۔ اور پھر وہ واقعہ بھی تمہیں یاد ہے؟

حضورِ خاتم النّبیین صلّی اللہ علیہ و سلّم صحابہؓ سے راہِ خدا میں کچھ دینے کو ارشاد فرماتے ہیں۔ ہر شخص اپنی اِستطاعت کے مطابق کوئی نہ کوئی چیز نقدی یا جِنس کی صورت میں حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں پیش کر رہا ہے۔ اتنے میں عمرؓ بہت سامالِ و دولت اور سازِ و سامان لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ حضورؐ اُن سے دریافت فرماتے ہیں کہ، عمرؓ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ عمرؓ عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ نصف کے لگ بھگ چھوڑ آیا ہوں۔ یہ باتیں ہو رہی ہوتی ہیں کہ صدیقِ اکبرؓ اپنے گھر کا سارا اثاثہ لیے حاضر ہو جاتے ہیں۔ حضورؐ ان سے فرماتے ہیں۔ ابوبکرؓ، گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ اس پر ابوبکرؓ عرض کرتے ہیں۔ حضورؐ ان کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کو چھوڑ آیا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کے سامنے دنیا اور اس کا سارا ساز و سامان کوئی وقعت نہیں رکھتا اور اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی خوشنودی باہمی تعاون اور ایثار سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تو بچو! آیندہ کے لیے تمہارا رویّہ کیا ہوگا؟" حامد صاحب نے کہا۔

سبھی بچے یک زبان ہو کر پکار اُٹھے "ہم ایثار سے کام لیں گے اور جہاں تک ہمارے بس میں ہے، ہم خدا کے حُکم کے مطابق ایک دُوسرے سے تعاون کریں گے؟"

"نعیم، تم بتاؤ کہ اب قلم کے سِلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" حامد صاحب بولے۔

"ابّا جان، قلم تو الگ رہا، میں اب ہمیشہ کے لیے وطیرہ بنا لوں گا کہ دُوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دوں اور اس مقصد کے لیے عزیز سے عزیز چیز کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کروں۔ باجی تو خیر میری بڑی بہن ہیں، میں جہاں تک ممکن ہوا اُن لوگوں کی مدد میں بھی پیش پیش رہوں گا جن سے میرا کوئی خُونی رشتہ نہیں اور جو انسان ہونے کے ناطے

میرے بھائی ہیں"۔ نعیم نے جواب میں کہا۔

"شاباش بیٹا۔ مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اور ہاں، حمیدہ، اب تمہارا رُوٹھنا بھی جائز نہیں۔ اُٹھو نعیم، باجی کو مناؤ اور حمیدہ، تم بھی چھوٹے بھائی کا ہنستے مُسکراتے استقبال کرو"۔ حامد صاحب نے کہا۔

اس طرح دونوں بہن بھائیوں کی باہمی رنجش ایک پُرمسرت ماحول میں ختم ہوئی۔ پہلے کی طرح آج بھی بچے زندگی بسر کرنے کا ایک کارآمد درس لے کر مجلس سے اُٹھے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ سبھی سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

مَشق

۱۔ آپ انگریزی میں FULL STOP سے تو ضرور واقف ہوں گے۔ اس زبان میں اس کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں جُملہ ختم ہو رہا ہو۔ اس کی علامت محض ایک چھوٹا سا نقطہ ہے۔ اُردو میں اسے "ختمہ" کہتے ہیں اور اس کا استعمال بھی جُملے کے خاتمے پر ہوتا ہے۔ یہاں اس کی علامت نُقطے (.) کی بجائے ایک نہایت ہی چھوٹا سا خط (ـ) ہے۔ مثلاً "میں جب گھر پہنچا تو ابّا جان نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا"۔ چونکہ اپنی جگہ یہ ایک مکمل جُملہ ہے اس لیے اس کے آخر میں "ختمہ" کا استعمال ہوتا ہے۔ ختمے کے استعمال کا ایک دُوسرا موقع وہ ہے جب آپ کسی نام، صفت یا خصوصیّت کو مخفّف کر کے لکھیں۔ مثلاً بی۔اے، ایل ایل۔بی۔

ختمے کے استعمال کو سمجھنے کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ آپ اُردو عبارتوں کو پڑھتے وقت ان پر غور کریں اور یہ دیکھتے جائیں کہ جُملہ کہاں مکمل ہُوا ہے۔ یا مخفّفات کہاں کہاں آتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو گذشتہ اور آیندہ اسباق سے بھی مدد مِل سکتی ہے۔

۲۔ اِیثار کے کیا معنی ہیں؟ ہمیں زندگی میں ایثار سے کیوں کام لینا چاہیے؟

۳۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے تعاون کی کیا شرائط ہیں؟

۴۔ حسبِ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے اور ان کے معنی بتائیے۔

خاتم النبیین، وطیرہ، اثاثہ، صدیق، مشکیزہ، تعاون، استقبال، گرامی۔

۵۔ بیان کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ماضی کے واقعات کو حال میں بیان کرتے ہیں۔ جیسے آج کے سبق میں آخری دو حکایتوں میں ہُوا ہے۔ آپ ان حکایتوں کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیجیے کہ فعل حال، ماضی میں بدل جائے۔

سلام

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سُبحانی
سلام اے فخرِ موجُودات، فخرِ نوعِ اِنسانی
سلام اے ظِلِّ رحمانی سلام اے نُورِ یزدانی
تِرا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی
سلام اے سِرِّ وحدت اے سراجِ بزمِ اِیمانی
زہے یہ عزّت افزائی زہے تشریف اَرزانی
تِرے آنے سے رونق آگئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہوگیا پھر فضلِ ربّانی
تِری صُورت، تِری سِیرت، تِرا نقشہ، تِرا جلوہ
تبسّم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی
زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہوچکی اجزائے ہستی کی پریشانی
زمیں کا گوشہ گوشہ نُور سے معمُور ہو جائے
تِرے پرتَو سے مِل جائے ہر اِک ذرّے کو تابانی

حفیظِ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ اُلفت

عقیدت کی جبیں تیری مروّت سے ہے نُورانی

تِرا در ہو مِرا سر ہو، مِرا دِل ہو ترا گھر ہو

تمنّا مختصر سی ہے مگر تمہید طُولانی

سَلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے

سلام اے خاک کے ٹُوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

(حفیظ جالندھری)

مَشق

۱ - ان سوالوں کے جواب دیجیے:-

و - آمنہ کے لال سے کون سی عظیم ہستی مراد ہے؟

ب - محبُوب سبحانی اور نورِ یزدانی کا مفہوم واضح کیجیے۔

ج - اس کا کیا مطلب ہے کہ:-

i - ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لَوحِ پیشانی

ii - ترے پرتو سے مِل جائے ہر اِک ذرّے کو تابانی

د - شاعر نے آخری تین اشعار میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے انھیں اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۲ - ان تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

نقشِ قدم ، عزّت افزائی ، گلزارِ ہستی ۔ گوشہ گوشہ ۔

۳ - "بے نوا" میں "بے" سابقہ ہے ، ایسے پانچ الفاظ لکھیے جن میں یہ سابقہ استعمال ہُوا ہو۔

۴ - چھٹے شعر کی نثر کیجیے۔

۵ - مذکر و مؤنث الگ الگ کرکے لکھیے:-

سلام ۔ نوُر ۔ قدم ۔ زندگی ۔ گلزار ۔ عزّت ۔ جلوہ ۔ قسمت ۔ گفتگو ۔ زمانہ ۔ ہستی ۔ کوچہ ۔
جبیں ۔ گھر ۔ زنجیر ۔ خاک ۔

میرا روزنامچہ

رضاء الرّشید آٹھویں جماعت کا طالب علم ہے۔ وہ نظم وضبط کا عادی ہے اور ہر کام ایک خاص سلیقے اور قرینے سے کرتا ہے۔ رات کے وقت تقریباً دو گھنٹے مطالعہ کرنا اور صبح سویرے اٹھنا اُس کے معمولات میں شامل ہے۔ گھر کے کام کاج میں اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ ہاکی اس کا پسندیدہ کھیل ہے۔ سکول کی ٹیم میں شامل ہوکر کئی میچوں میں حصہ لے چکا ہے۔ سونے سے پہلے دن بھر کے تمام اہم واقعات ڈائری میں قلمبند کرنا اس کے محبوب مشاغل میں سے ایک ہے۔ ذیل کی سطور میں اس کے ایک دن کی مفصل رُوداد ہے۔

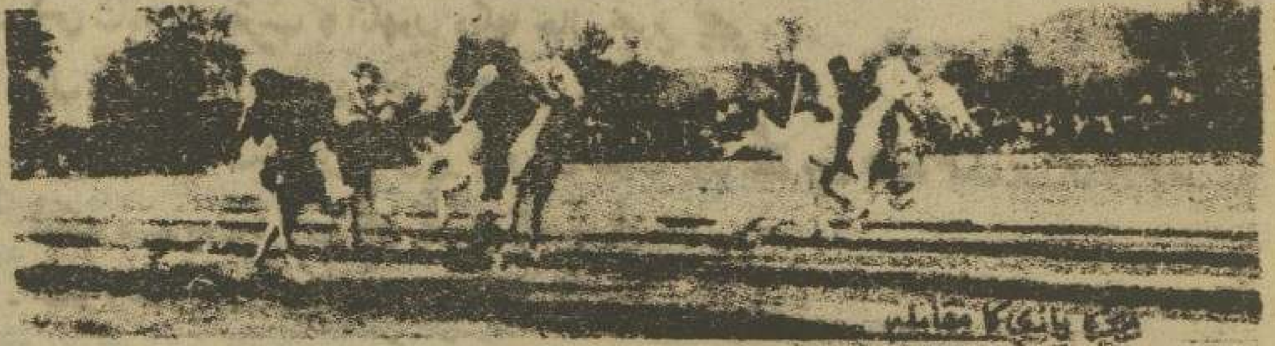
۱۱- اپریل ۱۹۷۶ء

آج صُبح سویرے اُٹھا۔ نہا دھوکر نماز پڑھی اور سیر کے لیے نِکل گیا۔ میرے گھر سے مُلحق باغات کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس میں ہر قِسم کے درخت موجود ہیں۔ باغات کے دُوسرے سِرے پر ایک ندی ہے جسے دُور سے دیکھو تو چاندنی کی ایک لکیر کی طرح دِکھائی دیتی ہے۔ میں عام طور پر انہی باغات سے ہوتا ہُوا ندی کی جانب نِکل جاتا ہوں صُبح کے وقت سبز سبز گھاس پر اوس کے قطرے یُوں لگتے ہیں جیسے مخمل پر کسی نے موتی ٹانک دِیے ہوں۔ درختوں پر پرندوں کی چہکار فضا میں ترنّم گھول رہی ہوتی ہے۔ قدرت کے اِن حسین نظّاروں سے لُطف اندوز ہوتا ہُوا ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ ابھی سُورج نہیں نکلا تھا اس لیے کچھ دیر کنارے کنارے چہل قدمی کرتا رہا۔ معًا مشرقی پہاڑیوں سے روشنی کی کرنیں پھُوٹنے لگیں اور سورج سونے کے تھال کی طرح آہستہ آہستہ بلند ہونا شرُوع ہُوا۔ ندی کا پانی جگمگا اُٹھا اور آنکھوں میں چکا چوند ہونے لگی۔

سیر کے بعد گھر واپس ہُوا، آج سکول سے چھٹی تھی کیونکہ ہمارے شہر میں سالانہ میلہ منعقد ہو رہا ہے۔ میں نے عمران سے میلے میں چلنے کا وعدہ کیا ہُوا تھا۔ تقریبًا نو بجے ہم دونوں گھر سے نِکلے اور تانگے میں بیٹھ گئے۔ یہ میلہ شہر سے تین کلومیٹر دُور ایک وسیع وعریض میدان میں جسے کرٹس گراؤنڈ کہتے ہیں، ہر سال باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ اِس میلے میں سارے ضلعے کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ تانگہ سڑک پر آیا تو ٹریفک کے بے پناہ ہجوم کی وجہ سے راہ چلنا مشکل ہوگیا۔ بچے، بُوڑھے جوان رنگ برنگ کا لباس پہنے میلے کی طرف جا رہے تھے۔ سائیکل سواروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔

تانگے والوں کی "ہٹو بچو" کی آوازوں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ جگہ جگہ پولیس کے سپاہی ٹریفک کو قابو میں رکھنے کے لیے کھڑے تھے۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد ہم میلے میں پہنچ گئے۔ وہاں کا سماں دیکھنے کے قابل تھا۔ میدان کے ایک طرف خوشنما رنگوں کے سائبان اور قناتیں لگی ہوئی تھیں، جن میں مختلف محکموں نے نمائش کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ایک طرف نیزہ بازی کے مقابلے ہو رہے تھے۔ گھڑ سوار چاق و چوبند گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جونہی کسی ٹیم کو نیزہ بازی کی دعوت ملتی، سوار نعرے لگاتے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے، ایک ہاتھ میں نیزہ اُٹھائے میدان میں داخل ہوتے، اور میدان کے وسط میں لکڑی کے کھونٹوں کو نشانہ بناتے۔ اُس وقت لوگوں کا جوش و خروش قابلِ دید



نیزہ بازی کا مقابلہ

ہوتا۔ تالیاں بجا بجا کر اور ڈھول پیٹ پیٹ کر کامیاب ہونے والوں کو داد دیتے۔ نیزہ بازی کے بعد کبڈی کے مقابلے شروع ہوئے۔ تنومند اور کسرتی بدن کے لوگ خم ٹھونک کر اور ڈھولک کی تھاپ پر ناچتے ہوئے آئے۔ اس کھیل میں جہاں داؤ پیچ کو اہمیت حاصل ہے وہاں پھرتی کا بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ اس لیے ان مقابلوں میں وہی کھلاڑی کامیاب ہوئے جن کی نس نس میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں اور جن کے جسم میں بے پناہ قوت تھی۔ کچھ دیر کے بعد اعلیٰ نسل کے بیلوں کی نمائش شروع ہوئی۔ سفید، سیاہ، دھاری دار بیل جن کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ میں نے سوچا میرے مُلک کا کسان کتنا عظیم ہے۔ ساون کی جھڑی ہو یا آگ برساتا ہوا سورج، کڑکڑاتے جاڑے ہوں یا پت جھڑ۔ اسے بس اپنے کام سے کام ہے۔ زمین کا سینہ چیر کر اہلِ وطن کے لیے غلّہ فراہم کرتا ہے، اور انھیں آسائش مہیا کرتا ہے۔ عمران نے مجھ سے کہا "وہ دیکھو اُس طرف لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ آؤ دیکھیں کیا ہو رہا ہے!" میں نے کہا "چلو"۔ وہاں پہنچے تو کیا دیکھا کہ پاکستانی فوج کے توپ خانے کا ایک دستہ صف باندھے کھڑا ہے۔ توپوں کے منہ آسمان کی طرف ہیں۔ گویا فضا کے دُشمنوں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک حوالدار لوگوں کو ہر ہتھیار کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ ہم اس کے قریب چلے گئے۔ میں نے اس سے کہا "حوالدار صاحب! ہم ذرا ٹینک دیکھنا چاہتے ہیں"۔ حوالدار نے خندہ پیشانی سے ہمیں اجازت دے دی۔ ہم دونوں دوست

ٹینک پر چڑھ گئے۔ عمران نے مجھ سے کہا "منیا کیا محسوس کر رہے ہو؟" "مجھے اپنا بدن فولاد کا لگتا ہے اور میں اپنے آپ کو پاکستان کی سرحدوں پر کھڑا ایک محافظ محسوس کر رہا ہوں" میں نے جواب دیا۔ "میں بڑا ہوکر فوجی بنوں گا اور اپنی دھرتی کی حفاظت کروں گا" عمران نے کہا "اور میں پاکستان کی فضاؤں کا محافظ بنوں گا" میں نے کہا۔ اب سورج ڈھل رہا تھا اور شام کے سائے لحظہ لحظہ گہرے ہونے لگے تھے، اس لیے ہم نے گھر کی راہ لی۔

مَشق

۱۔ کسی شادی کی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال تحریر کیجیے۔

۲۔ ایک ہفتے کے اہم واقعات اپنی نوٹ بک میں لکھیے۔

۳۔ "صبح کے وقت سبز سبز گھاس پر اوس کے قطرے یوں لگتے ہیں جیسے مخمل پر کسی نے موتی ٹانک دیے ہوں" اِس قسم کے تین جملے بنائیے۔

۴۔ الفاظ و محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

چکا چوند ہونا، تنومند، کسرتی، صف باندھنا، ترنم، فراہم کرنا۔

۵۔ جدول میں مذکر کے سامنے مؤنث اور مؤنث کے سامنے مذکر درج کیجیے۔

مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث
بَیل	ــــ	دنبہ	ــــ	ــــ	نائن
استاد	ــــ	بھکاری	ــــ	ــــ	ممانی

۶۔ اعراب لگائیے اور تلفظ کی مَشق کیجیے۔

ترنم، مفصل، اوس، حسین، لطف، ندی، ضبط۔

۷۔ افتخار نے کھانا کھایا۔ اُس نے ایک گول کیا۔ پولیس نے چور کو پکڑا۔ ان جملوں میں کھایا، کیا، پکڑا فعل ہیں۔ اور چونکہ ان افعال کا فاعل موجود ہے، اِس لیے ان افعال کو فعل معرُوف کہتے ہیں۔

اب چند جملے اور ملاحظہ کیجیے۔

چور پکڑا گیا۔ کتاب لکھی گئی۔ وہ مارا گیا۔ پانی پیا جاتا ہے۔ ہمیں بلایا جائے گا۔ ان جملوں میں پکڑا، لکھی، مارا، پیا، اور بلایا افعال ہیں مگر ان کے فاعل موجود نہیں۔ ایسے افعال کو قواعد میں فعل مجہول کہتے ہیں۔ آپ اس سبق کے افعال معروف و مجہول الگ الگ کر کے لکھیے۔

قائدِ اعظمؒ اور طلباء

۱۸۹۳ء کی بات ہے کہ کراچی کا ایک نو عمر طالب علم انگلستان میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے پہنچا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کسی تعلیمی اِدارے میں داخل ہو اس نے وکالت کی تعلیم دینے والے چار مشہور اِداروں کا مطالعہ اور معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے راہنما کے ساتھ تین اِداروں کو دیکھنے کے بعد جب چوتھے تعلیمی اِدارے میں داخل ہُوا جس کا نام "لنکن اِن" تھا تو اس کی دیوار پر ایک خُوب صورت تحریر دیکھ کر اپنے راہنما سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ راہنما نے جواب دیا۔ دنیا میں جتنے بھی مقنّن (قانون دینے والے) گزرے ہیں ان کے نام اس دیوار پر لکھے ہیں۔ نوجوان طالب علم نے پوچھا کہ سب سے پہلا نام کس کا ہے؟ راہنما نے جواب دیا مقنّنِ اعظم (قانون دینے والوں میں سب سے بڑے) حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ و سلّم کا نام ہے۔ یہ سنتے ہی نوجوان طالب علم وہیں رُک گیا اور ذہن میں فیصلہ کر لیا کہ اِسی اِدارے میں قانون کی تعلیم حاصل کرے گا۔

یہ نوجوان طالب علم جس نے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ و سلّم کا نام سُنتے ہی اپنے تعلیمی مستقبل کا فیصلہ کر لیا، اس کا نام محمد علی جناحؒ تھا جو ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہُوا اور بعد میں قائداعظمؒ کے نام سے مشہور ہُوا جس کا نام آج پاکستانی قوم کے ہر بچے، بوڑھے جوان، مرد اور عورت کی محبّت اور عقیدت کا مرکز ہے۔ قائدِاعظمؒ کے اس تاریخی فیصلہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ سے کتنی محبّت اور گہری عقیدت موجود تھی۔

قائدِاعظمؒ جب "لنکن اِن" سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرکے وطن واپس ہوئے تو بمبئی میں وکالت شرُوع کی۔ ایک مرتبہ ایک مجسٹریٹ کی رخصت کے دَوران میں قائدِاعظمؒ نے مجسٹریٹ کی جگہ کام کرکے حکومت برطانیہ پر اپنی قابلیت کا سکّہ بٹھا دیا۔ حکومت نے آپ کو ۱۶۰۰ روپے ماہوار تنخواہ پر مجسٹریٹ کی اسامی پیش کی لیکن آپ نے اس پیش کش کو یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ اتنے روپے مَیں ایک دن میں کمانا چاہتا ہوں اور اپنی یہ خواہش سچ کر دکھائی۔ آزادیٔ ہند کی جدوجہد کے لیے آپ کانگریس میں شامل ہوگئے اور پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ لیکن کانگریس کے مُسلم کُش مقاصد دیکھ کر آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے

جب قوم اپنے قائد کی دیانت داری، خلوص اور بلند ہمّتی کی قائل ہوگئی تو اس کے اعتراف میں ۱۹۳۸ء میں سب سے پہلی مرتبہ مولانا مظہر الدّین نے دہلی کے ایک سہ روزہ اخبار میں محمد علی جناح کے لیے "قائدِ اعظمؒ" کا لفظ استعمال کیا جو آگے چل کر اُن کے نام کا ایک جزو بن گیا۔ چند ماہ بعد پٹنہ کے اجلاس میں جب قائدِ اعظم جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو مسلم لیگ کے ایک سرگرم کارکن میاں فیروز الدّین نے پہلی مرتبہ "قائدِ اعظمؒ زندہ باد" کا نعرہ گرجدار آواز میں بلند کیا۔ آپ نے ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کو ایک فعال جماعت بنا کر ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ پاکستان کے خواب کو سچ کر دکھایا، اور اپنی عظیم قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ آزاد اسلامی مملکت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

قائدِ اعظمؒ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود نوجوان طالب علموں سے آخری دم تک قریبی تعلق برقرار رکھے رہے۔ اُنھیں یقین تھا کہ مسلمانوں کو ایک غیر مسلم قوم کی غلامی سے نجات دلانے میں طالب علم سب سے نمایاں کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے تمام عمر طلبا سے قریبی رابطہ قائم رکھا اور ہمیشہ ان کی راہنمائی کرتے رہے۔ طلباء نے بھی اپنے قائد کے ہر حکم پر لبیک کہا۔ تحریکِ پاکستان میں قائدِ اعظمؒ کی راہنمائی میں یونیورسٹی، کالج اور سکولوں کے طلباء ایک خاص قومی لگن سے تدریسی اداروں کی چاردیواری سے نکل کر ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے اور ہر جگہ قائدِ اعظمؒ کا پیغام پہنچا کر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی طلبا نے اپنے قائد کی ہدایات کے مطابق ملکی اور قومی مفادات کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

آزادی کی جد وجہد کے دوران میں ۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو لاہور میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا۔

"یاد رکھیے یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ یہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال سے لے کر اب تک سب سے بڑا کام ہے جو آپ نے اپنے ذمّہ لیا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے تمام وسائل کو کام میں لانا پڑے گا۔ ہر ممکن طریقے سے مکمل تیاری کرنا پڑے گی۔ میں آپ سے کہوں گا کہ جذبات کے دھارے میں نہ بہہ جائیے اور محض نعروں کی لپیٹ میں نہ آئیے۔"

۱۵ نومبر ۱۹۴۲ء کو جالندھر میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس میں طلبہ کو قوم کی سچے دل سے خدمت کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

"میں آپ کو مصروفِ عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں۔ کام، کام اور بس کام۔ سکونِ خاطر

صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جائیے"۔

بلوچستان میں ۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو قائدِ اعظم نے علم حاصل کرنے پر زور دیتے ہوئے طلباء سے فرمایا۔

"یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے صرف حفاظت کے لیے اُٹھے گی۔ لیکن فی الحال جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے۔ علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ جائیے اور علم حاصل کیجیے"۔

ایک اور موقع پر ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں بلند کرداری اور حبّ الوطنی کا سبق دیتے ہوئے طلباء سے مخاطب ہوکر فرمایا۔

"میں پاکستان کے ہر باشندے اور بالخصوص نوجوانوں کو یہ بات اچھی طرح بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ خدمت، ہمّت اور برداشت کے سچّے جذبے کا مظاہرہ کریں۔ ایسی شریفانہ اور بلند مثالیں قائم کریں کہ آپ کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں آپ کی تقلید کریں"۔

"اپنا اخلاق ہر صورت میں بلند رکھو۔ موت سے نہ ڈرو۔ ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لیے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیے۔ مسلمان کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نجات نہیں ہو سکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مرجائے"۔

پاکستانی طلبہ کے احساسِ ذمّہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اور موقع پر یوں گویا ہوتے ہیں:۔

"پاکستان کو اپنے جوانوں اور بالخصوص طلبہ پر فخر ہے جو آزمائش اور ضرورت کے وقت ہمیشہ صفِ اوّل میں رہے ہیں"

طلبہ کو نظم و ضبط کا درس دیتے ہوئے فرمایا کہ "آپ مستقبل کے معمار ہیں اس لیے جو مشکل کام آپ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نمٹنے کے لیے اپنی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کیجیے۔ مناسب تعلیم اور مناسب تربیت حاصل کیجیے۔ آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیے کہ آپ کی ذمّہ داریاں کتنی زیادہ اور کتنی شدید ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیے"۔

۱۳ جولائی ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالج پشاور میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہم ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلامی اصولوں کو آزما سکیں" اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ

قائدِ اعظمؒ کا علیحدہ ملک حاصل کرنے کا مقصد ایک اسلامی ریاست کا قیام تھا۔

قائدِ اعظمؒ پاکستانی طلبہ کو حصولِ علم کے دوران ملکی سیاست سے پوری طرح باخبر رہنے کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں حصّہ نہ لینے کا بھی مشورہ دیتے تھے۔ ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں اُنھوں نے طلباء کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"میرے نوجوان دوستو! میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کسی سیاسی جماعت کے آلۂ کار بن گئے تو یہ آپ کی سب سے بڑی غلطی ہوگی .... اب میں آپ کو ہی پاکستان کا حقیقی معمار سمجھتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنی باری پر کیا کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔ اس طرح رہیے کہ کوئی آپ کو گمراہ نہ کر سکے۔ کوئی آپ کو غلط طور پر استعمال نہ کر سکے۔ اپنی صفوں میں مکمل استحکام اور اتحاد پیدا کیجیے۔ آپ کا اصل کام کیا ہونا چاہیے! اپنی ذات سے وفا۔ اپنے والدین سے وفا۔ اپنی مملکت سے وفا اور اپنے مطالعہ پر کامل توجّہ"

قائدِ اعظم انگریز کے رائج کیے ہُوئے طرزِ تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ اِس طرزِ تعلیم کا واحد مقصد غیر ملکی حکومت کے لیے پڑھے لکھے اور تربیّت یافتہ کلرک پیدا کرنا تھا۔ اس لیے قیامِ پاکستان کے بعد نظامِ تعلیم کو بدلنے پُر زور دیتے ہوئے ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا:۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ، آپ کا ذہن، آپ کے مقاصد آپ کی تمنّاؤں کا رُخ دُوسرے راستوں، دُوسرے میدانوں اور دوسری منزل کی طرف ہونا چاہیے جو آپ کے لیے کھلی پڑی ہیں۔ دستی کام اور محنت کرنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے ہاں ٹیکنیکل تعلیم کی بڑی گنجائش ہے۔ کیونکہ ہمیں کلرکوں کے بجائے کاری گروں اور ہُنر مندوں کی اَشد ضرورت ہے۔ آپ معاشیات' بنک کاری۔ تجارت اور قانون وغیرہ کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جن سے آپ کے لیے ترقی کے امکانات موجود ہیں۔..... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سرکاری ملازمت کی نسبت کہیں زیادہ فائدے میں رہیں گے۔ اگر آپ تجارت، کاروبار، صنعت وحرفت کی راہ پر چلیں گے تو آپ نہ صرف بہت زیادہ خوش رہیں گے بلکہ خوش حال بھی۔ اس سے صرف آپ ہی کو فائدہ نہ پہنچے گا بلکہ پاکستان کو بھی فائدہ ہوگا"

اپریل ۱۹۴۸ء میں پشاور میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:۔

"میرے نوجوان دوستو! آپ اپنی شخصیّت کو محض سرکاری ملازم بننے کے خول میں محدود نہ کیجیے۔ اب نئے میدان، نئے راستے اور نئی منزلیں آپ کی منتظر ہیں۔ سائنس، تجارت، بنک، بیمہ صنعت وحرفت اور فنّی تعلیم کے شُعبے آپ کی توجّہ اور تجسّس کے محتاج ہیں"

شہری دِفاع

آج رات مکمّل تاریکی ہے۔ وقفے وقفے سے سائرن کی آواز آتی ہے۔ کبھی کبھی اڑھائی منٹ تک مسلسل سائرن بجتا ہے۔ یہ خطرہ ٹل جانے کی علامت ہے۔ سارے بچّے نیلوفر خالہ کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ کچھ سہمے سہمے سے لگ رہے ہیں۔ نیلوفر چار بچّوں احسن، محسن، عرفانہ اور صدف کی خالہ ہیں۔ وہ بچوں کو خبردار کر رہی ہیں کہ اس وقت وقفے وقفے سے سائرن کی آواز دشمن کے حملے کا پتہ دے رہی ہے۔ وہ اُنھیں بتا رہی ہیں کہ دشمن کے جہاز ہماری فضائی حدود میں آگئے ہیں اور ہمارے ملک میں شہری آبادیوں پر حملہ کرکے پُلوں، کارخانوں، ریل کی پٹڑیوں، سڑکوں اور رسل و رسائل کے دیگر ذرائع کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ کئی ماؤں کو بے آسرا، کئی سہاگنوں کو بیوہ اور کئی بچّوں کو یتیم بنانا چاہتے ہیں۔ اُن کا مقصد عام لوگوں میں بے چینی اور خوف و ہراس پیدا کرنا بھی ہے۔ ایسے عالم میں ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اپنے حوصلے کو بلند رکھیں اور جہاں ہمارے جیالے سرحدوں پر وطنِ عزیز کا دفاع کر رہے ہیں وہاں ہمیں ملک کے اندر رہ کر یہی فرائض انجام دینے چاہئیں۔ ہمیں چاہیے کہ کسی قِسم کے خوف و ہراس کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیں اور پورے عزم اور ہمّت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔ اپنے گھروں، گلیوں، سڑکوں، پُلوں، کھیت کھلیانوں اور کارخانوں کی اس طرح حفاظت کریں کہ دُشمن اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو سکے اور اس کے وہ تمام منصوبے جو اس نے ہمیں ہراساں کرنے کے لیے بنا رکھے ہیں، خاک میں مِل جائیں۔ اس کے لیے ہمیں اس کے ہوائی حملوں سے بچاؤ کی تدابیر اختیار کرنا ہوں گی۔ جلد ہی محسن نے خالہ سے پوچھا۔ "جب دُشمن کے ہوائی جہاز آ جائیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" خالہ نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"بھئی، بات یہ ہے کہ دُشمن کے جہازوں کی آمد کا پتہ چلتے ہی ہمارے شاہین اُن کا راستہ روکنے کے لیے فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھار دفاعی لائن توڑ کر وہ مُلک کے اندر آجاتے ہیں۔ اس سے بچاؤ کے لیے ہمیں گھروں، گلیوں، بازاروں اور میدانوں میں رات کو بالکل روشنی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ روشنی کی ایک کرن اور ایک دھبّا بھی بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دُشمن کے جہاز اس سے آبادی کا سُراغ پاکر ہم پر اندھا دھند بمباری کر سکتے ہیں جس سے دوسرے نقصانات کے علاوہ کئی قیمتی جانوں کے ضائع

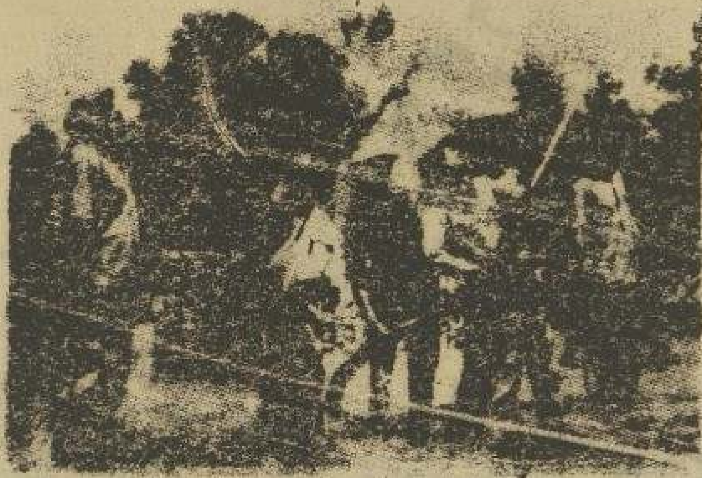
ہونے کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس موقع پر ہمیں گھروں میں ہی رہنا چاہیے جیسا کہ شہری دفاع کمیٹی کے نگران یا وارڈن کی ہدایت ہے ہمیں گھر کے سب سے مضبوط کمرے میں چلے جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں ہمیں چند دیگر امور کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ مثلاً جس کمرے میں ہم بند ہوں اس میں زیادہ دروازے نہ ہوں۔ اگر کھڑکیاں ہوں تو ان کے شیشے اتار کر لکڑی کی تختیاں لگا دی جائیں کیونکہ شیشوں کے ٹوٹ جانے سے زخمی ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہاں اگر ہو سکے تو کمرے میں ایک بڑی سی مضبوط میز بھی رکھ دینی چاہیے۔" احسن بولا" وہ کیوں؟"

خالہ نے جواب دیا" اس لیے کہ کمرے کی چھت اگر گر بھی جائے تو میز کے نیچے پناہ لی جا سکے۔" عرفانہ بولی" خالہ جان، میں نے دیکھا ہے کہ آج لوگ مختلف مقامات پر خندقیں کھود رہے تھے۔ وہ کیوں؟" خالہ نے کہا" بیٹی وہ اس لیے کہ جب ہوائی حملے کا خطرہ ہو تو لوگ ان میں گھس کر اپنی جانیں بچا سکیں۔ خندقیں عام طور پر مقامی میونسپل کمیٹی، پولیس سٹیشن یا شہری دفاع کے کسی ادارے کی جانب سے کھودی جاتی ہیں۔ یہ اکثر انگریزی حرف W کی شکل میں ہوتی ہیں۔ ان کی گہرائی ڈیڑھ میٹر اور چوڑائی اوپر سے ایک میٹر اور نیچے سے پون میٹر ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے خطوط کی لمبائی اڑھائی اڑھائی میٹر اور درمیانی زاویہ اسّی درجے سے نوّے درجے تک ہوتا ہے۔" صدف نے پوچھا" ہمیں کس وقت خندق میں جانا چاہیے؟"

خالہ نے بتایا کہ وقفے وقفے سے اڑھائی منٹ تک سائرن کی آواز خطرے کا پتہ دیتی ہے۔ اس وقت ہمیں خندق کے ایک سرے سے اس میں داخل ہونا چاہیے اور ایڑیوں کے بل کانوں پر ہتھیلیاں اور منہ میں رومال رکھ کر خاموش ہو جانا چاہیے۔ اگر اڑھائی منٹ تک لگاتار سائرن کی آواز آتی رہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ خطرہ ٹل گیا۔ اب خندق سے دوسری جانب سے نکل جانا چاہیے۔ ہاں، اگر خندق نہ ہو اور آپ کھلے میدان میں ہوں تو زمین پر لیٹ جانا چاہیے، لیکن چھاتی اوپر ہو اور کہنیاں زمین پر لگی ہوئی ہوں تاکہ دھماکہ ہونے کی صورت میں زمین میں پیدا ہونے والی لرزش سے دل کو نقصان نہ پہنچے۔ اگر بس، کار یا ٹرک پر جا رہے ہوں تو اسے بائیں جانب سڑک کے کنارے کھڑا کر دیں تاکہ شہری دفاع کی گاڑیاں آسانی سے آ جا سکیں۔ لیکن یاد رہے کہ پولیس سٹیشن، شہری دفاع کے کیمپ، پانی کے نل یا ٹینک کے قریب بالکل گاڑیاں نہ کھڑی کریں۔ اگر آپ کے پاس تانگہ ہے تو اسی طرح اسے سڑک کے بائیں جانب کھڑا کر دیں۔ گھوڑے کو کسی درخت سے باندھ دیں۔ یاد رہے کہ بجلی کے کھمبے یا پانی کے نل کے ساتھ اسے نہ باندھیے کہ یہ بہرحال خطرناک ہے۔ ہاں تو بھئی مجھے اس قدر تفصیل میں جانے کی یوں ضرورت پیش آئی کہ آپ شہری دفاع کی چند بنیادی باتوں سے آگاہ ہو جائیں۔"

"خالہ جان کیا شہری دفاع صرف جنگ کے دنوں ہی کے لیے ضروری ہے؟" صدف نے پھر سوال کیا۔

"نہیں بھئی، ہمیں شہری دفاع کی ضرورت اور کئی موقعوں پر بھی پیش آتی ہے۔ اِس مقصد کے لیے باقاعدہ تنظیمیں قائم ہوتی ہیں جو ٹریفک کے حادثات میں زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد بہم پہنچاتی ہیں، کہیں آگ لگ جانے کی صورت میں اُس کے بجھانے کا بندوبست کرتی ہیں۔ ایسی تنظیمیں سیلابوں میں بھی بڑی مفید خدمات انجام دیتی ہیں۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ ہمارے ملک کے اکثر میدانی علاقے برسات کے دنوں میں شدید سیلابوں کی زد میں ہوتے ہیں۔ دریاؤں میں طغیانی کی وجہ سے پانی کناروں سے باہر آجاتا ہے۔ کروڑوں روپوں کی فصلوں اور اِملاک کی تباہی کے ساتھ ساتھ سینکڑوں افراد لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں انجمن ہلالِ احمر اور دیگر سماجی اداروں کے ساتھ مِل کر شہری دفاع کی تنظیمیں امدادی کام میں فوجی جوانوں اور سِول حکّام کا ہاتھ بٹاتی ہیں اور لوگوں کو پانی اور دلدل سے نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچاتی ہیں۔ ایّامِ جنگ میں کسی بھی وقت دُشمن کی بمباری سے آگ لگ سکتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ آگ بڑی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے اگر اُسے بجھانے کا بروقت انتظام نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک تاریخی واقعہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جنگِ عظیم دوم میں جب جاپان کے مشہور شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر بمباری ہوئی تھی تو اُس وقت داخلی طور پر ملک کے اندر شہری دفاع کی کوئی بھی مضبوط تنظیم موجود نہ تھی۔ اِن شہروں میں ایسی آگ بھڑکی کہ اس نے مکانوں، دکانوں، انسانوں، حیوانوں سبھی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی دھڑکتی مچلتی زندگی موت کی آغوش میں سوگئی۔ خالہ جان بچّوں کو یہ باتیں بتا ہی رہی تھیں کہ اُنھوں نے جھٹ سے پُوچھ لیا۔ "کیا خالہ جان، شہری دفاع کی تنظیم ہر شہر میں ہوتی ہے؟" خالہ جان نے اُنھیں بتایا "ہاں بھئی، ہر شہر کیا، ہر محلّے میں ہوتی ہے۔ اس کے مختلف حلقے یا سیکٹر ہوتے ہیں جو اپنی اپنی حدُود میں خدمات انجام دیتے ہیں۔ جب گذشتہ جنگ میں بھارتی پائلٹ نے جہاز سے گولیوں کی بوچھاڑ کی تو ہاجرہ مائی کے مکان میں گھاس پھُونس سے آگ لگ گئی۔ اس وقت مکان میں اس کا بڑا لڑکا حمید گل سویا ہُوا تھا۔ وہ بے چارہ مرگیا۔ اس کی لاش کو کتنی مشکل سے باہر لایا گیا۔ اس کا شاید آپ کو اندازہ نہیں۔ رضا صاحب نے جو شہری دفاع کمیٹی میں ہمارے محلّے کے نگران (وارڈن) ہیں جسم پر ایک بھیگی ہوئی بوری کو لپیٹا، ایک رسّی اپنی کمر میں ڈالی اور مکان میں گھس گئے۔ پچھواڑے کی کھڑکی کو کھولا اور حمید کی کمر اور ٹانگوں میں رسّی ڈال کر بڑی تیزی سے اُسے باہر لے آئے۔ باقی سارے لوگ ریت کی بالٹیاں بھر بھر کر لا رہے تھے اور آگ کے بھڑکتے ہُوئے شعلوں پر ڈال رہے تھے یہاں تک کہ وہ اُسے بجھانے میں



کا جواب تم کو مل گیا: تو پھر تو اس طرح کی تنظیمیں ہر شہر اور ہر محلے میں قائم ہونا ضروری ہیں؟

"خالہ جان! شہری دفاع کی تنظیموں میں کام کرنے والوں کو کیا تنخواہ بھی ملتی ہے؟" عرفانہ نے پوچھا۔ "نہیں، یہاں تنخواہ ونخواہ کا معاملہ نہیں، ساری بات خدمت کی ہے۔ عوام کے تعاون کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ جنگ بھی انہی کے تعاون سے جیتی جاتی ہے۔ ملک کے اندر دفاعی سمتوں کا تعین اور دشمن کے حملے سے بچنے کی تدابیر بھی بندوق چلانے سے کچھ کم نہیں" خالہ نے جواب میں کہا۔

بچے آہستہ آہستہ سونے لگے لیکن خالہ جان شب بھر ان کے پاس چوکس ہو کر بیٹھی رہیں۔

مشق

۱ - جنگ کے زمانے میں ہم ملک کے اندر اپنا دفاع کیونکر کر سکتے ہیں؟

۲ - شہری دفاع کی تنظیمیں کیوں ضروری ہیں؟

۳ - خندق کی کھدائی میں کیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے؟

۴ - جنگ کے دنوں میں سائرن بجنے کی آواز آتے ہی ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

۵ - آگ لگنے کی صورت میں ہم اسے بجھانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر سکتے ہیں؟

۶ - درجِ ذیل الفاظ اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

اشھا دھند۔ عزائم۔ شاہین۔ ذرائع۔ پیش خیمہ۔ کبھی کبھار۔ حدود۔ نقصان دہ۔ چوکس۔ رسل و رسائل۔

۷ - "میں اور تم"، "کوچہ و بازار"، "سکول اور گھر"، "آمدورفت"۔ ان مثالوں میں حرف 'اور' اور 'و' کا استعمال ہوا ہے۔ اسے اصطلاح میں حرفِ عطف کہا جاتا ہے۔ جب یہ حرف دو کلموں کو ملاتا ہے تو اس طرح جو صورت بنتی ہے اسے قواعد میں مرکبِ عطفی کہتے ہیں۔ آج کے سبق میں جہاں جہاں بھی اس مرکب کا استعمال ہوا ہے، آپ اسے الگ کر کے اپنی کاپی میں درج کر لیجیے، اور اپنی جانب سے اس مرکب کی کم از کم پانچ مثالیں بہم پہنچائیے۔

نمودِ صُبح

نجومِ فلک جھلملانے لگے | چراغِ سحر ٹمٹمانے لگے
کھنچے کس لیے دِل نہ ہو تان پر | کہ لے کر رہی ہے اثر جان پر
سُریلی صدا ہوش کھونے لگی | ستاروں کو وحشت سی ہونے لگی
وہ بُوٹوں میں کلیاں چٹکنے لگیں | وہ شاخوں پہ چڑیاں چہکنے لگیں
نسیمِ سحر گُل کھلانے لگی | فضائے چمن رنگ لانے لگی
ضیا آسماں سے اُترنے لگی | نظر دُور تک کام کرنے لگی
عنادِل گلستاں میں گانے لگے | طیورِ سحر دل لبھانے لگے
وہ پَو پھٹ کے والصبح پڑھنے لگی | ضیا دم بدم اور بڑھنے لگی
وہ اللہ اکبر کی آئی صدا | نہا دھو کے مسجد چلے پارسا
وہ سب اوّلیں وقت پڑھ کے نماز | ہُوئے محوِ ترتیل با سوز و ساز
وہ مینا پہاڑی وہ کالا کوّا | ہُوئے آکے شاخوں پہ نغمہ سرا
شعاعیں دکھانے لگیں وہ جھلک | ہُوئی زعفرانی بساطِ فلک
وہ زردی ذرا اور گہری ہُوئی | پہاڑوں کی چوٹی سُنہری ہُوئی

مُطلّا ہُوا گنبدِ ہر شجر
برسنے لگا ہر طرف آبِ زر

(بے نظیر شاہ)

مَشق

۱- اس نظم میں صُبح کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ ایسی نظم جس میں کوئی منظر، قِصّہ، واقعہ تاریخ وغیرہ طویل اور مسلسل مضمون میں بیان کیا جائے اُسے مثنوی کہتے ہیں۔ مثنوی کے ہر شعر کا الگ قافیہ ہوتا ہے لیکن ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔
۲- اس نظم کے پہلے تین اشعار کے قافیے کون کون سے ہیں نشان لگائیے۔
۳- چوتھے اور پانچویں شعر کی تشریح کیجیے۔
۴- آٹھویں، نویں اور دسویں شعر کو سلیس نثر میں تحریر کیجیے۔
۵- نظم کے آخری شعر کا مطلب بیان کیجیے۔ ۶- نمودِ صبح کے منظر پر ایک مضمون تحریر کیجیے۔
۷- اس نظم میں درج اِسمِ نکرہ اور اِسمِ صفت کی الگ الگ فہرست مرتب کیجیے۔

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی سرسید احمد خاں کے رفقار میں ممتاز حیثیت کے مالک اور قابل ترین بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ایک شخص شاعر، فلسفی، مورّخ، ماہر تعلیم، واعظ اور محدث سب کچھ ہو سکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی۔ انھوں نے سب علوم وفنون کا اپنی ذات میں اجتماع کرلیا تھا مگر ادب وتاریخ اور سیرت نگاری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

مولانا ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، اس کے بعد تحصیلِ علم کے لیے دور دراز کا سفر کیا۔ اس زمانہ کے مشہور علماء سے عربی، فارسی، فقہ اور حدیث کے علوم کی تکمیل کی۔ اُنیس سال کی عمر میں ارضِ مقدس کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور حج کو چلے گئے۔ واپسی پر قانون کا امتحان پاس کرکے اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی لیکن طبیعت کو اس پیشہ سے لگاؤ نہ تھا اس لیے علمی کاموں میں مصروف ہوگئے اور علی گڑھ میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ قیامِ علی گڑھ کا زمانہ اُن کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ علماء وفضلاء کی صحبت اور سرسید کے کتب خانہ سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ وہیں پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات ہوئی۔ مولانا نے ان سے فرانسیسی زبان سیکھی اور ان کو عربی سکھائی۔ اس دوران میں مولانا نے مثنوی "صبحِ امید" لکھی جس میں اسلام کی شان وشوکت موجودہ مسلمانوں کی حالتِ زار اور ان کی عظمتِ رفتہ کے لیے سرسید کی کوششوں کا ذکر پر زور طریقوں سے کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مشاہیر اسلام کے نام سے ایک سلسلۂ تصانیف شروع کیا اور "المامون" اور "سیرت النعمان" لکھی اور اسی دوران میں پروفیسر آرنلڈ کے ہمراہ روم، شام اور مصر کا سفر کیا اور واپسی پر اپنا سفرنامہ شائع کیا۔

سرسید کے انتقال کے بعد مولانا نے علی گڑھ کالج کی ملازمت چھوڑ دی اور اعظم گڑھ جا کر ہمہ تن "الفاروق" کی تصنیف میں مصروف ہوگئے۔ آپ کی تصانیف میں زیادہ کتب تاریخی اور سوانحی ہیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ اسلام کی قدیم شان وشوکت، اور مسلمانوں کے زرّیں کارنامے اس انداز سے تحریر میں لائے جائیں کہ وہ دلوں پر نقش ہوجائیں اور ایک مکمل تاریخ اسلام اور تاریخ خلفائے عباسیہ مرتب کی جائے۔ چنانچہ المامون، سیرت النعمان، الفاروق اور تاریخ اسلام وغیرہ ان کی مایۂ ناز تصانیف ہیں جن سے ان کی تاریخی معلومات، وسیع تحقیق اور علم کا پتہ

چلتا ہے۔ مولانا کا مقصد مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کو جدید سانچوں میں ڈھال کر اس طرح پیش کرنا تھا کہ ان میں اپنے ماضی کے متعلق احساسِ فخر پیدا ہو اور اپنے حال اور مستقبل کو شاندار بنانے میں کوشاں ہوں، آپ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ اسلامی تہذیب کا عہدِ ماضی انسانی تمدن کا ایک درخشاں دور تھا۔ لہٰذا آج بھی انسانی تہذیب کی ترقی کا راز ماضی کی طرف رجوع کرنے میں ہے ان کے نزدیک ترقی اور کمال کا انحصار نیک جذبات پر ہے۔ یہ نیک جذبات جس وقت بھی پیدا ہوں انسانیت تنزل سے نکل کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔

بحیثیت سیرت نگار کے بھی مولانا کا مرتبہ بہت بلند ہے "الفاروق" حضرت عمرؓ کے حالاتِ زندگی اور ان کے عہدِ خلافت پر ایک مفصل کتاب ہے اور سچ تو یہ ہے کہ سیرت فاروقؓ پر نہ صرف ہندو پاکستان میں بلکہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ کتاب کی تیاری میں صحیح اور معتبر ماخذ کا پتہ چلانے کے لیے قسطنطنیہ، ایشائے کوچک اور مصر کے بڑے بڑے شہروں میں گئے۔ ایک اور کتاب " اورنگ زیب عالمگیرؒ پر ایک نظر " میں صحیح تاریخی واقعات کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تنگ نظر ہندوؤں اور عیّار انگریزوں نے اورنگ زیب پر ہندوؤں سے تعصب برتنے کے جو الزامات لگائے ہیں وہ سراسر غلط ہیں۔

مولانا کی دیگر بلند پایہ تصانیف میں شعرالعجم، الغزالی، الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم، اور دیوانِ شبلی وغیرہ ہیں لیکن ان سب سے بڑھ کر سیرت النبیؐ ہے جو آپ نے ایسی تحقیق اور جستجو سے لکھی ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت اسے سند مانتی ہے۔ تاریخ اور سیرت کے علاوہ انھوں نے فارسی اور اُردو میں بلند پایہ شعر بھی کہے ہیں۔ آپ کا اردو کلام جو قومی، اخلاقی اور اصلاحی نظموں پر مشتمل ہے ایک مجموعے کی صُورت میں چھپ چکا ہے۔ مضمون نگاری میں بھی آپ کا طرزِ تحریر عالمانہ ہے۔ عربی فارسی کے الفاظ نہایت مناسبت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کی تحریروں میں صفائی سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ آپ کی قابلیت اور علمی خدمات کے اعتراف میں سلطانِ ترکی نے تمغۂ مجیدی اور حکومتِ برطانیہ نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔

مولانا شبلی کی ایما پر لکھنؤ میں ایک مدرسہ ندوۃ العلماء قائم ہُوا جس کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اصلاح شدہ نصاب رائج کیا گیا۔ اسلامی علوم کے علاوہ جدید علوم اور انگریزی کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور اخلاقی تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ اس مدرسہ کے قیام کا
تھا کہ یہاں سے ایسے علماء پیدا ہوں، جو قدیم اور جدید علوم پر پوری طرح عبور رکھتے
سہ کے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ایک ماہرِ تعلیم بھی
میں ایسے نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے جو مسلمانوں کی قومی ضروریات

کا خیال رکھتے ہوئے علوم جدید سے بھی بہرہ مند ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے اصلاحِ تعلیم پر بھی متعدد مضمون لکھے۔ ایک رسالہ "الندوہ" کا اجراء کیا۔ اس رسالہ کے ذریعہ سے قومی، ادبی اور سیاسی مسائل کی اشاعت کی۔ رسالہ کے اجراء کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں ایسا علمی اور ذہنی انقلاب پیدا کیا جائے جس سے مسلمان اپنے ماضی سے واقف ہو سکیں۔ ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے عربی مدارس کی اصلاح کے لیے ایک تحریک شروع کی۔ اس طرح حکومت بھی اس بات پر اُن سے بدظن ہو گئی اور بہت سے علماء بھی نصابِ تعلیم میں اصلاح کے مخالف ہو گئے۔ اسی مقصد کے تحت "دارالعلوم ندوۃ العلماء" کی بنیاد رکھی گئی۔ اگرچہ مولانا شبلی کو اس مدرسہ کے چلانے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس مدرسہ نے ایسے علماء پیدا ہوئے جن کی تصانیف کے دنیا میں ایک علمی اور ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا نے اس مدرسہ سے علیحدگی اختیار کر لی، اور سیرت النبیؐ کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ ابھی اس کی دو ہی جلدیں لکھی تھیں کہ عمر نے وفا نہ کی اور باقی کام آپ کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے آپ کی ہدایت کے مطابق مکمل کیا۔

مولانا کو عرصہ سے مصنفین کی ایک جماعت قائم کرنے کا خیال تھا۔ اس مقصد کے لیے آپ نے اپنا مکان، باغ اور کتب خانہ وقف کر کے اعظم گڑھ میں "دارالمصنفین" کے قیام کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن یہ حسرت ان کے دل ہی میں رہی اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا کا انتقال ہو گیا۔ تاہم آپ کی وفات کے تین دن بعد آپ کے احباب اور شاگردوں نے "دارالمصنفین" کے قیام کو عملی صورت دے دی جس کا قیام برِصغیر کے مسلمانوں کی دینی، تہذیبی اور علمی تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ اور شبلی کی سال ہا سال کی آرزوؤں اور تمناؤں کا حاصل تھا۔

مشق

۱۔ مولانا شبلی نعمانی کی مثنوی "صبحِ امید" کس موضوع پر لکھی گئی ہے؟
۲۔ مولانا شبلی کی تصانیف کے پسِ پردہ کون سا خاص مقصد تھا؟
۳۔ قوم کی ترقی کے لیے مولانا اور سر سید احمد خاں کے خیالات میں کیا فرق تھا؟
۴۔ سیرت کے موضوع پر شبلی نعمانی کی تصانیف کی فہرست مرتب کیجیے۔
۵۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کس غرض سے قائم کیا گیا تھا؟
۶۔ مولانا ایک ماہرِ تعلیم تھے۔ اس پر مختصر نوٹ لکھیے۔
۷۔ سیرت کی سب سے اہم تصنیف کون سی ہے اور اس میں مولانا نے کس کی سوانح حیات لکھی تھی؟
۸۔ مندرجہ ذیل جمع الفاظ سے واحد بنائیے:۔ رفقاء۔ علوم و فنون۔ علماء۔ فضلا۔ تصانیف۔ خلفاء۔ معلومات۔ روایات۔ ممالک۔ مصنفین۔ الزامات۔
۹۔ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے:۔
شان و شوکت۔ حالتِ زار۔ عظمتِ رفتہ۔ ہمہ تن۔ کارنامے۔ درخشاں۔ بدظن۔

وقت کی پابندی

ہماری زمین نہایت تیزی کے ساتھ سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ اسّی کروڑ کلومیٹر کے اس سفر کو وہ ان گنت صدیوں سے طے کر رہی ہے اور پورے تین سو پینسٹھ دن گزرنے کے بعد وہ اپنا ایک دورہ مکمل کرتی ہے۔ لیکن اِس باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ وہ اپنے سفر کو لاتعداد برسوں سے جاری رکھے ہوئے ہے کہ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔ اسی طرح سورج کے گرد اور بھی کئی سیارے گھوم رہے ہیں۔ مشتری، زہرہ، زحل، مریخ، عطارد وغیرہ۔ وہ بھی زمین کی طرح نہایت پابندی کے ساتھ اپنے دورے مکمل کرتے ہیں اور کبھی ان میں سیکنڈ کے سوویں حصّے کے برابر فرق نہیں آیا۔ اگر یہ اپنی مقررہ رفتار سے تیز یا سُست چلیں تو اس کے نتیجے میں یہ اجرام آپس میں ٹکرا جائیں اور دنیا میں قیامت برپا ہو جائے۔ جہاں تک ہماری زمین کا تعلق ہے، وہ یکساں رفتار سے نہ صرف سورج کے گرد گھومتی ہے، بلکہ وہ اپنے محور پر بھی پوری پابندی کے ساتھ ایک جیسی رفتار سے گردش کر رہی ہے۔ اِسی گردش کی بدولت دن رات اور ہمیشہ ٹھیک وقت پر موسم بدلتے رہتے ہیں۔

کارخانۂ قدرت میں ہر چیز وقت کی پابند ہے۔ سورج ہو یا چاند، دن ہو یا رات، گرمی ہو یا سردی، یہ سب قدرت کے نظام کے بندھنوں میں ایسے بندھے ہوئے ہیں کہ اپنے مقرر کردہ فرائض کو پابندی کے ساتھ ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر یہ وقت کی پابندی نہ کریں تو کارخانۂ قدرت نہیں چل سکتا اور ان کی یہ پابندی انسان کے لیے ایک سبق ہے۔ اُسے بھی اگر اس دُنیا میں کامیاب ہونا ہے تو وقت کی پابندی کرے۔ وقت کی پابندی کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کو ٹھیک اُن اوقات میں پورا کریں جو اُن کے لیے مقرر ہیں۔ اگر ہم نے ایسا کرنے میں غفلت برتی تو ہم اِس دُنیا میں کبھی کامیاب زندگی نہیں بسر کر سکتے۔

آپ طالب علم ہیں۔ آپ کا سکول باقاعدگی کے ساتھ ہر روز وقت مقررہ پر لگتا ہے اور مقررہ وقت پر بند ہوتا ہے۔ پھر ہر مضمون کے لیے بھی وقت مقرر ہے۔ آپ اگر ٹھیک وقت پر سکول آتے ہیں، کبھی سکول سے غیر حاضر نہیں ہوتے، ہر مضمون کے گھنٹے میں کلاس میں اپنے ذہن اور جسم دونوں کو حاضر رکھتے ہیں۔ جو کچھ اُستاد پڑھاتا ہے اسے توجہ سے سُنتے ہیں۔ سکول کے بعد بھی آپ نے اپنے اوقات کو تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک مقررہ وقت روزانہ آپ اپنے آموختہ کو دوبارہ پڑھنے

اور یاد کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ کچھ وقت آپ نے اپنی تفریح، ورزش اور کھیل وغیرہ کے لیے مقرر کیا ہُوا ہے۔ سونے جاگنے اور دوسرے تمام امور کے لیے آپ نے اپنے وقت کو تقسیم کیا ہُوا ہے جس کی آپ سختی سے پابندی کرتے ہیں تو بے شک آپ کا شمار قابل ترین طلباء میں ہوگا۔ ایسے طلباء جو ہمیشہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ لیکن جو طلباء سکول میں وقت پر حاضر نہ ہوتے ہوں مختلف مضامین کے پیریڈ میں پابندی سے حاضری نہ دیتے ہوں، اگر وہ جسمانی طور پر کلاس میں حاضر ہوں تو بھی ذہنی طور پر وہ گلی کوچوں، بازاروں اور راستوں میں بھٹکتے پھرتے ہوں، پیریڈ کے دوران اُنہیں معلوم ہی نہ ہوسکے کہ اساتذہ نے کیا پڑھایا ہے۔ سکول سے جانے کے بعد وہ کتابوں کو کھول کر نہ دیکھیں۔ ہر وقت کھیل کود میں لگے رہیں۔ ایسے طلبا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، کیونکہ اُنہوں نے وقت جیسی گراں بہا چیز کی قدروقیمت کو نہ جانا اور اسے ضائع کر دیا۔

واشنگٹن امریکہ کے مشہور صدر ہو گذرے ہیں۔ ایک دن ان کے سیکرٹری وقت سے چند منٹ بعد دفتر پہنچے۔ صدر امریکہ نے دیر میں آنے کی وجہ پوچھی۔ سیکرٹری نے بہانہ تراشا کہ ان کی گھڑی شاید کچھ پیچھے تھی جس کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ صدر امریکہ نے اپنے سیکرٹری سے کہا۔ " میں وقت کا بڑا پابند ہوں اور مجھے ایسے ہی آدمی پسند ہیں جو وقت کی پابندی کریں۔ یا تو تم اپنی گھڑی تبدیل کرو ورنہ مجھے اپنا سیکرٹری تبدیل کرنا ہوگا"۔ اندلس کے مشہور فلاسفر اور جید عالم علامہ ابن رُشد کے بارے میں مشہور ہے کہ اُنہوں نے طالب علمی کے دوران اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کہ ہر رات کھانے اور نماز سے فارغ ہوکر کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہوجاتے یہاں تک کہ اُنہیں نیند آجاتی۔ لیکن تمام زندگی میں صرف دو راتیں ایسی آئیں جن میں اُنہوں نے مجبوراً مطالعے کا ناغہ کیا۔ ان میں ایک اُن کی شادی کی اور دوسری ان کی وفات کی رات تھی۔ مطالعے کو پابندی کے ساتھ جاری رکھنے ہی کی بدولت ابن رُشد نہ صرف اپنے زمانے کے بڑے عالم تسلیم کیے گئے، بلکہ صدیوں کے بعد اب بھی ان کا نام ایک عالم، ایک فلاسفر اور ایک مفکر کی حیثیت سے زندہ ہے۔

الغرض وقت ایک نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ عربی کا ایک مقولہ ہے " اَلْوَقْتُ مِنْ ذَھَب" یعنی وقت سونا ہے۔ لیکن عقل مند کہتے ہیں کہ وقت سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات سب سے قیمتی چیز ہے بلکہ " اَلْوَقْتُ ھُوَالْحَیَاتُ" یعنی وقت ہی زندگی ہے جس نے اِسے صحیح طور پر استعمال کیا وہ کامیاب ہُوا۔ یہ قیمتی دولت ہر شخص کو قدرت کی طرف سے یکساں عطا ہوتی ہے۔ جو لوگ اِس دولت اور اس سرمایے کو ٹھیک طرح سے اور مناسب موقع پر استعمال کرتے ہیں، وہ جسمانی راحت اور روحانی مسرّت حاصل کرتے ہیں۔ اس کو پابندی کے ساتھ استعمال کرنے سے ایک جاہل عالم، ایک مفلس امیر، ایک نادان عقل مند اور ایک بے ہنر ہنرمند بن جاتا ہے۔

جس شخص نے بچپن ہی سے اس سرمایے کی قدر جانی اور اسے موقع پر پابندی کے ساتھ استعمال کیا وہ زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہوسکتا۔ لیکن جو لوگ بچپن میں اس کی قدر و قیمت کو نہ سمجھتے ہوئے اسے ضائع کرتے ہیں وہ دنیا میں کبھی کامیاب زندگی نہیں بسر کرسکتے۔ اس دنیا میں ہم جتنے کامیاب اور بڑے لوگ دیکھتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے وقت کی اہمیت کو سمجھا۔ وقت کے پابند ہوئے اور اسے ٹھیک طور پر استعمال کیا۔ اور یہاں جتنے بھی غریب اور تنگ دست لوگ نظر آرہے ہیں یقیناً انھوں نے اپنے وقت کی قدر نہیں کی اور اس کی پابندی سے دُور بھاگتے رہے۔

طالب علمی کا دور انسانی زندگی کا اہم ترین زمانہ ہے۔ اس میں طالب علم علوم و فنون سیکھتا ہے۔ ذہنی، جسمانی اور اخلاقی طور پر ترقی کرتا ہے۔ لیکن علوم و فنون سیکھنے اور ذہنی، جسمانی و اخلاقی ترقی کرنے کے لیے وقت کی پابندی ضروری ہے۔ اور کسی نے یہ بات کتنی سچی کہی ہے کہ "پابندیٔ اوقات کامیابی کی کنجی ہے"۔ سمجھ دار طلباء اپنی عمرِ عزیز کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے۔ وہ ہر کام کو قاعدے کے مطابق اور مناسب موقع پر پابندی سے کرتے ہیں۔ وہ پڑھنے کے وقت میں نہایت توجہ اور دلجمعی سے پڑھتے ہیں۔ کھیلنے کے وقت کھیلتے ہیں۔ جو کام آج کرنا ہے اسے کل پر کبھی اٹھا نہیں رکھتے کیونکہ کل ایک دھوکہ ہے اور وقت کو ضائع کرتا ہے۔ ایک معمولی طالب علم بھی ہر روز کے وقت سے ایک گھنٹہ نکالے اور پابندی کے ساتھ اس ایک گھنٹے میں صرف بیس صفحے توجہ سے پڑھ ڈالے تو وہ ایک سال میں سات ہزار تین سو صفحے پڑھ ڈالے گا۔ اس طرح پابندی سے ایک گھنٹہ کا وقت دینے کے عوض وہ اپنی کلاس کی تمام کتابوں کو ازبر کرلے گا۔ چنانچہ وہ اپنے امتحان میں کبھی ناکام نہیں ہوسکتا۔ مگر جس طالب علم نے وقت کی قدر نہ جانی۔ اس نے وقت کے مناسب استعمال اور پابندی کا خیال نہ رکھا وہ کبھی علم حاصل نہیں کرسکتا اور نہ زندگی میں کبھی بڑا آدمی بن سکتا ہے۔

ہمارے پیارے نبیؐ کی ایک حدیث کا ترجمہ ہے "جب کوئی دن طلوع ہوتا ہے تو وہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اے انسان! میں ایک نو پیدا مخلوق ہوں۔ میں تیرے عمل پر گواہ ہوں۔ مجھ سے کچھ حاصل کرنا ہے تو حاصل کرلے"۔ انسان کو ایک ساعت کی بربادی سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی کبھی نہیں ہوسکتی۔ انسان کو لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرے۔ ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام مقرر کرے۔ دن رات کا کوئی لمحہ وہ بےکار نہ رہے کیونکہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"۔

عزیز طلباء! یہ وقت جو آپ کو علم حاصل کرنے کے لیے ملا ہے، یہ خدا کی دی ہوئی بڑی قیمتی دولت ہے۔ یاد رکھیے، کامیابی وقت کی مناسب تقسیم اور کام کرنے پر منحصر ہے۔ سکول میں تو

آپ کے کام کے لیے اوقات کی مناسب تقسیم ہے۔ ہاں سکول کے بعد آپ اپنے اوقات کی مناسب تقسیم کر لیجیے۔ پھر ہر کام کو اُس کے وقت پر پُورا کیجیے تو آپ کا حال اور مستقبل دونوں درخشندہ ہو جائیں گے۔

مشق

۱۔ اگر زمین اور سیارے اپنی مقررہ رفتار کو کم کر لیں یا زیادہ تو کیا نتیجہ نکلے گا؟

۲۔ وقت کی پابندی سے کیا مطلب ہے؟

۳۔ وقت کی پابندی نہ کرنے والوں کو کیا نقصان اُٹھانا پڑتا ہے؟

۴۔ وقت کے بارے میں رسولِ اکرمؐ کی کوئی حدیث یا اس کا ترجمہ بتائیے۔

۵۔ ذیل میں جو جملے دیے گئے ہیں انھیں درست کیجیے:

۱۔ میں نے نماز کے لیے وضو کرنا تھا۔ ۲۔ محمود اور احمد دونوں کو کھانا کھانا تھا۔ ۳۔ آپ دن بدن کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ ۴۔ درحقیقت میں میرے پیٹ میں درد تھا۔ ۵۔ میں نے بڑی دیر آپ کی انتظار کی آپ نہ آئے۔ ۶۔ میں اچھا اردو نہیں لکھ سکتا ہوں نہ بول سکتا ہوں۔ ۷۔ کامیابی وقت کے مناسب تقسیم سے ہوتا ہے۔ ۸۔ اپنی زندگی کا ایک لمحا بھی ضائع نہ کریں۔

جمہوریہ اِنڈونیشیا

برِصغیر پاک و ہند کے مشرق میں سمندروں میں گھِرے ہوئے چھوٹے بڑے بے شمار جزائر ہیں۔ ان جزائر میں قدرت کی فیاضیوں کی وہ فراوانی ہے کہ ایک دور میں پوری دنیا انھیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ماضی میں اُنھیں جزائرِ شرقُ الہند کہا جاتا تھا اور اب وہ عظیم اِسلامی مملکت انڈونیشیا کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

انڈونیشیا کے محلِ وقوع اور دیگر جغرافیائی حالات کی طرح یہاں کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ ہے، یہاں کے باشندوں کی اکثریت انڈونیشی یا ملائی ہے لیکن وقتاً فوقتاً دیگر ممالک کے لوگ بھی یہاں آکر آباد ہوتے گئے۔ ان باہر سے آنے والوں میں برِصغیر پاک و ہند کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ آبادی کا ایک حصّہ عرب، چین اور یورپی ممالک سے آئے ہوئے لوگوں پر بھی مشتمل ہے۔ ان تمام لوگوں نے یہاں کے مقامی باشندوں سے شادی بیاہ اور دیگر قسم کے روابط استوار کر لیے اور رفتہ رفتہ زندگی کے تمام امور میں دخیل ہوگئے اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ ان میں اور انڈونیشیا کے اصل باشندوں میں کسی قسم کی تمیز ممکن نہیں رہی۔ یہ سبھی مل کر عظیم انڈونیشی قوم کہلاتے ہیں۔

قدیم ترین انڈونیشی باشندے جنوب مغربی چین سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ یہ آج سے کوئی چار ہزار برس قبل کی بات ہے۔ ماہرینِ تاریخ کے نزدیک قدیم دور کے انڈونیشیوں کی دو قسمیں تھیں۔ پہلے گروہ نے اندرونی حصوں میں بلند مقامات پر رہنا پسند کیا لیکن دوسری قسم کے لوگ ساحل پر آباد ہوئے اور "ساحلی ملائی" کہلائے۔ لیکن انڈونیشیا کی تاریخ میں چین سے زیادہ برِصغیر پاک و ہند کو اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ چینیوں کی ابتدائی تجارت کے وقت انڈونیشیا میں برِصغیر کی تجارت جاری تھی اور غالباً یہاں کے تاجروں نے وہاں چند بستیاں بھی بسا لی تھیں۔ ابتدا میں یہ لوگ انڈونیشیا میں سونے، چاندی اور قلعی کی تلاش میں جاتے رہے اور آخرکار ان کی ایک معقول تعداد نے وہیں آباد ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ سماترا اور جاوا میں پتھر کی بنی ہوئی یادگاروں پر برِصغیر کے قدیم رسم الخط کے کچھ نمونے پائے گئے ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں سماترا اور جاوا میں ایسی مملکتیں وجود میں آچکی تھیں جن کے برِصغیر پاک و ہند سے بڑے گہرے روابط تھے۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں انڈونیشیا میں مسلمانوں کی عام آمد و رفت ہونے لگی تھی۔ وہ ان جزیروں میں اگرچہ تجارت کی غرض سے آتے تھے لیکن دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت کو بھی

وہ اپنا ایک اہم فرض تصوّر کرتے تھے۔ چنانچہ اُنھی کے اثر سے یہاں کے باشندے دینِ اسلام کی طرف راغب ہونے لگے۔ انڈونیشیا میں اسلام کے سب سے پہلے مبلّغ حضرت مولانا برہان الدین رحمتہ اللہ علیہ تھے جو عراق سے بہ سلسلہ تجارت و تبلیغ یہاں تشریف لائے تھے۔ انڈونیشیا میں سب سے پہلا مسلمان حکمران ملک الصالح تھا اور سب سے پہلی مسجد جاوا میں دیماک کے مقام پر تعمیر کی گئی۔ یہ مسجد "مسجدِ قدوس" کے نام سے مشہور ہے اور نو ستونوں پر قائم ہے۔ مسلمان صوفیاء، علماء اور تاجروں نے یہاں تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں اور رفتہ رفتہ یہاں کی بہت بڑی آبادی مشرف بہ اسلام ہوگئی آج انڈونیشیا کے چھیانوے فی صد سے زیادہ باشندے اسلام کے پیروکار ہیں۔

سولہویں صدی عیسوی میں پرتگیزوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا اور آہستہ آہستہ ملک کے خاص حصے پر قابض ہوگئے۔ اُنھوں نے یہاں کے باشندوں پر طرح طرح کے ظلم توڑے۔ ان کی مذہبی یادگاریں مٹا دیں اور قبریں اکھاڑ اکھاڑ کر ان کے پتھروں سے قلعے تعمیر کیے۔ سینکڑوں ہزاروں بے گناہ مسلمان ان کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ پرتگیزوں کو اسلام سے سخت نفرت تھی اس لیے اُنھوں نے بزورِ شمشیر ان جزیروں میں عیسائیت کو پھیلانے کی کوشش کی لیکن اُنھیں اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ کیونکہ ان کی یہ حرکات انڈونیشیا کے مسلمان حکمرانوں کی برہمی کا باعث بنیں اور اُنھوں نے تہیّہ کر لیا کہ وہ جس طرح بھی ہُوا اپنی سرزمین سے پرتگیزوں کو نکال باہر کریں گے۔

اسی اثناء میں ولندیزی اور انگریز ان جزیروں میں پہنچے۔ اندرونی طور پر مقامی حکمرانوں کی مخالفت پرتگیزوں کے اقتدار کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھی اور بیرونی طور پر ان کا مقابلہ ولندیزیوں اور انگریزوں سے تھا۔ آخرکار اُنھیں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور عبرت ناک شکست سے دوچار ہوکر ان جزیروں سے نکلتے ہی بنی۔ چونکہ انگریزوں کی زیادہ تر توجہ برِصغیر پاک و ہند اور نئی دنیا پر تھی اس لیے اُنھوں نے جلد ہی انڈونیشیا کو چھوڑ دیا۔ اب میدان ولندیزیوں کے لیے خالی تھا۔ اُنھوں نے مقامی حکمرانوں کی باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھا کر ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کردی۔ ہوتے ہوتے وہ پورے انڈونیشیا پر قابض ہوگئے اور تقریباً تین سو برس تک یہاں حکمرانی کرتے رہے۔

ولندیزیوں کی آمد کے وقت ان جزیروں میں چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستیں قائم تھیں۔ ان ریاستوں کے حکمران معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتے تھے۔ اِنھی باہمی ناچاقیوں سے ولندیزیوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور تھوڑی ہی مدت میں سارے انڈونیشیا کو اپنا غلام بنا لیا۔ لیکن ملک میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ ولندیزی نہ صرف یہاں کے قدرتی وسائل سے نوع بنوع فائدے حاصل کر رہے تھے بلکہ اُنھوں نے لوگوں کے مذہبی امور میں بھی کھلم کھلا

مداخلت شروع کر دی تھی۔ حکومت کے سائے میں عیسائیت کی جبری تبلیغ کا آغاز ہو چکا تھا جس سے مسلمانوں کے جذبات بڑی شدت سے مجروح ہو رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ آزادی پسند خم ٹھونک کر میدان میں آگئے اور ولندیزی اقتدار کے خلاف جدّوجہد کا آغاز کر دیا۔ تحریکِ آزادی کی ابتداء جزیرۂ سماترا سے ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے جزائر میں بھی اس کے اثرات پھیل گئے۔ بالآخر بیسویں صدی کے شروع میں اُس نے ایک ملک گیر منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں اِنڈونیشیا جاپانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ہرچند جاپانیوں نے انڈونیشیا والوں کو یقین دلایا کہ ہم تمھیں جلد آزاد کر دیں گے۔ لیکن وہ بھی کوئی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے۔ جاپانیوں کے تیوروں سے بھانپ گئے کہ وہ اُنھیں مستقلاً اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں چنانچہ اُنھوں نے زیادہ شدّت کے ساتھ آزادی کی جدوجہد شروع کر دی۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان نے شکست کھائی تو ولندیزیوں نے ازسرِ نو یہاں قبضہ جمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ یوں انڈونیشیا کے عوام اور ولندیزیوں کے درمیان جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا لیکن انجمن اقوامِ متحدہ کی مداخلت سے یہ خطرہ ٹل گیا اور دسمبر ۱۹۴۹ء میں انڈونیشیا ایک آزاد جمہوریہ کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر اُبھرا۔ ڈاکٹر احمد سوئیکارنو مرحوم جمہوریہ انڈونیشیا کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

انڈونیشیا زمین کا سالم ٹکڑا نہیں بلکہ تین ہزار سے زاید چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ایک مجمع الجزائر ہے۔ اس میں ایسے چھوٹے جزیرے بھی ہیں جن کا رقبہ صرف چند مربع کلومیٹر ہے اور اتنے بڑے بھی جن کی لمبائی سولہ سو کلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔ ان جزیروں کے ساحلوں کو بحرالکاہل، بحرِ ہند اور بحیرۂ جنوبی چین کی موجیں نہلا نہلا کر گزرتی ہیں۔ اس مجمع الجزائر کے بڑے جزیروں میں جاوا، سماترا اور بورنیو، اپنے قدرتی حسن اور دل کشی کے باعث دنیا بھر کے سیّاحوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔

انڈونیشیا عین خطِ استوا پر واقع ہے اس لیے یہاں تمام سال سخت گرمی پڑتی ہے۔ سہ پہر تک شدّت کی گرمی اور اس کے بعد سخت بارش یہاں ہر روز کا معمول ہے۔ لیکن یہی خصوصیت اس خطّے کی فضاؤں کو سدا بہار بھی کر گئی ہے۔ جس سمت نگاہ اُٹھا کر دیکھیے ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ قِسم قِسم کے درخت اور طرح طرح کے پھول پھل جنّت کا سا سماں پیش کرتے ہیں۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ربڑ کے درخت یہاں کی بہت بڑی دولت ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے کسان گنّے، تاڑ، تمباکو، کافی، اور چائے کی کاشت کرتے ہیں جن سے ملک کو بے شمار مالی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ سنکونا بھی یہاں کی خاص پیداوار ہے جس سے کونین بنتی ہے۔ کالی مرچ اور دوسرے گرم مصالحے بھی اِنڈونیشیا میں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ بید، ساگوان اور سنبل کی روئی یہاں کی دوسری اہم پیداواریں ہیں۔ یہاں پھل اتنی قسموں کے ہوتے ہیں کہ بیرونی ممالک میں لوگوں کو ان کے نام تک معلوم نہیں۔ انڈونیشیا کی

دیگر قسم کی نباتات میں فرن (بے پھول کے پودے) اور برگد اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں عجیب و غریب قسم کی بیلیں پائی جاتی ہیں جنھیں "لیانا" کہتے ہیں۔ ان میں بعض انسان کی ران کے برابر موٹی اور سینکڑوں فٹ لمبی ہوتی ہیں۔ درختوں کے سبز منظر میں طرح طرح کے خوشنما پھول یہاں کے قدرتی حسن میں اضافے کا باعث ہیں۔ ان میں مشہور زمانہ "رفلزیا" بھی شامل ہے جو دُنیا کا سب سے بڑا پھول ہے بعض حالات میں اس پھول کی چوڑائی ایک میٹر تک ہوتی ہے۔

اِنڈونیشیا کی معدنی پیداوار میں تیل سب سے اہم ہے۔ برآمدات سے اِنڈونیشیا کو جو آمدنی ہوتی ہے اس میں بڑا حصّہ اس دولت کا ہے جو وہ تیل سے کماتا ہے۔ تیل کے علاوہ مینگنیز، نِکل، سونا، چاندی، اور قلعی یہاں کی اہم معدنیات ہیں۔

اِنڈونیشیا میں ماہی گیری باقاعدہ ایک صنعت کی حیثیت سے رائج ہے۔ سمندری ساحلوں سے کثیر مقدار میں مچھلی حاصل کی جاتی ہے۔ اندرون ملک بڑے بڑے تالابوں اور جوہڑوں میں مچھلیاں پالنے کا نہایت معقول بندوبست ہے۔ یہ مچھلیاں نہ صرف ملکی باشندوں کی غذائی ضروریات کو پورا کرتی ہیں بلکہ دوسرے ممالک کو برآمد بھی کی جاتی ہیں۔

یہ خطۂ زمین اپنے گنجان جنگلوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ان جنگلوں میں وحشی جانوروں کی بڑی کثرت ہے جن میں بندر، شیر، گینڈے اور دس دس میٹر لمبے اژدہے قابلِ ذکر ہیں۔ درختوں کی شاخوں پر رنگ برنگے پروں والی چڑیاں پھدکتی پھرتی ہیں۔ پھولوں پر بیٹھی نازک نازک سی تتلیاں ان کے حسن کو چار چاند لگاتی ہیں۔ ساحلی علاقوں میں مگرمچھ بھی خوفناک جبڑے کھولے نظر آجاتے ہیں۔

انڈونیشیا اگرچہ نہایت حسین مناظر کی سرزمین ہے مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی مناظر ایک ہولناک صورت اختیار کر لیتے ہیں جب ان کے درمیان کوئی آتش فشاں پورے زور و قوت سے لاوا اُگلنے لگتا ہے۔ زمین کے سینے سے اُبلتی ہوئی یہ آگ انسانوں کے دل دہلا کر رکھ دیتی ہے کیونکہ یہ آگ بڑھ اور پھیل کر کسی بھی وقت اِنسانی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ اس اعتبار سے انڈونیشیا دنیا کا خطرناک ترین آتش فشانی خطہ شمار کیا جاتا ہے۔

اِنڈونیشیا کے باشندے گندمی رنگ اور گٹھیلے بدن کے مضبوط اِنسان ہیں۔ وہ بے حد ذہین اور محنتی ہیں۔ فطرتاً بڑے نرم دل اور بُردبار ہیں۔ مذہب کے بڑی سختی سے پابند ہیں۔ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ فریضۂ حج کی ادائیگی کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ وہ عموماً سادہ لباس پہنتے ہیں۔ "سرانگ" یعنی دھوتی عورتوں اور مردوں کا مشترک لباس ہے۔ مردانہ لباس میں سیاہ مخملی ٹوپی ایک ضروری جزو ہے جسے انڈونیشیا [illegible] کیا جاتا [illegible] کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ ان لوگوں

کو رقص، موسیقی اور ڈرامے سے بے حد شغف ہے۔ کٹھ پتلیوں کا تماشا بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ کٹھ پتلیوں کے کھیل میں قدیم کہانیاں اور عوامی روایات پیش کی جاتی ہیں۔ یہاں کے لوگ رقص میں زرق برق لباس پہنتے ہیں اور پنکھ، پھول، چھتریاں، جلتی ہوئی شمعیں اور خنجر استعمال کرتے ہیں۔ انڈونیشیا کی دستکاریوں میں خوب صورت ترین چیز بچّوں کے کھلونے ہیں جو کاغذ، بانس، مٹّی، موم، کیلے کے تنے، پتّوں اور ناریل کے خول سے تیار کیے جاتے ہیں۔ کھلونوں میں ٹوپیاں، چھتریاں، سانپ، جھنجھنے اور کئی دوسری قسم کے کھلونے شامل ہیں۔



انڈونیشی بچے سڑک پار کر رہے ہیں

آزادی کے بعد انڈونیشیا نے تعلیمی، اقتصادی اور تجارتی میدانوں میں بڑی ترقّی کی ہے۔ آزادی کے وقت یہاں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد صرف سات فی صد تھی۔ آزادی کے بعد سے اب تک ملک کے گوشے گوشے میں سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں۔ حکومتِ انڈونیشیا کے ایک اعلان کے مطابق اب ملک سے جہالت اور ناخواندگی کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ یہاں صنعتوں کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ معدنیات بالخصوص پٹرول کی صنعت کو بہت ترقی ہوئی ہے۔ بیرونی ممالک کے ساتھ تجارت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کے علاوہ انڈونیشیا نے امریکہ اور مغربی یورپ سے بھی تجارتی معاہدے کر رکھے ہیں۔

پاکستان اور انڈونیشیا کے درمیان شروع دن ہی سے گہرے دوستانہ روابط قائم ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں انڈونیشیا نے ہمارے ساتھ جس خلوص، ہمدردی اور بھائی چارے کا مظاہرہ کیا اس کی یاد

ہمارے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوگی۔ انڈونیشیا اسلامی سیکرٹریٹ کا رکن اور عالمگیر اسلامی برادری کے مضبوط سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

انڈونیشیا کے عوام اپنے وطن کی سالمیت اور آزادی کو بہر طور عزیز رکھتے ہیں۔ وہ اگرچہ تین ہزار سے زاید چھوٹے بڑے جزیروں میں زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ وہ سب ایک ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے باہمی اتحاد میں رخنہ اندازی نہیں کر سکتی۔

مَشق

۱ - درج ذیل سوالوں کے جواب دیجیے:

ا- اِنڈونیشیا میں اِسلام کی اشاعت کیسے ہوئی؟

ب- اِنڈونیشیا میں اِسلام کے سب سے پہلے مبلغ کون بزرگ تھے؟

ج- پرتگیز کن وجوہات کی بنا پر انڈونیشیا میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے؟

(د) انڈونیشیا میں تحریکِ آزادی کا آغاز کیسے ہُوا؟

(ہ) پاکستان اور انڈونیشیا کے باہمی تعلقات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے۔

۲ - "انڈونیشیا کے لوگ" اسے عنوان بناکر ایک پیرا سپردِ قلم کیجیے۔

۳ - حسبِ ذیل الفاظ میں جو جمع ہیں ان کے واحد اور جو واحد ہیں ان کی جمع بنا کر کاپی میں درج کیجیے۔

روابط، رکن، جزائر، ملک، امُور، مسجد، صوفیاء، حرکات، خطرہ، مناظر۔

۴ - مندرجہ ذیل اقتباسات کے معنی بتائیے۔

(ا) "اِن جزائر میں قدرت کی فیاضیوں کی وہ فراوانی ہے کہ کسی دور میں پوری دنیا اُنھیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔"

(ب) "ان تمام لوگوں نے یہاں کے مقامی باشندوں سے شادی بیاہ اور دیگر قسم کے روابط استوار کر لیے اور رفتہ رفتہ زندگی کے تمام امور میں دخیل ہو گئے۔"

(ج) "وہ ان جزیروں میں اگرچہ تجارت کی غرض سے آئے تھے، لیکن دینِ حق کی تبلیغ واشاعت کو بھی وہ اپنا ایک اہم فرض تصور کرتے تھے۔"

(د) "ہرچند جاپانیوں نے انڈونیشیا والوں کو یقین دلایا کہ ہم تمھیں جلد آزاد کر دیں گے۔ لیکن وہ بھی کوئی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے۔ جاپانیوں کے تیوروں سے بھانپ گئے کہ وہ اُنھیں مستقلاً اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔"

وُہ دیس ہمارا ہے

جس دیس کی دھرتی میں
خُوشبو ہے بہاروں کی

وہ دیس ہمارا ہے ـــــ وہ دیس ہمارا ہے

جس دیس کی مٹی سے
اُٹھا ہے خمیر اپنا
جس دیس کے نغموں سے
جاگا ہے ضمیر اپنا
جس دیس کے ذرّوں سے
رونق ہے ستاروں کی

وہ دیس ہمارا ہے ـــــ وہ دیس ہمارا ہے

جس دیس نے توڑا ہے
زنجیر غلامی کو
آتی ہیں نئی صبحیں
اب جس کی سلامی کو
وہ جس کی ہواؤں میں
ٹھنڈک ہے پھواروں کی

وہ دیس ہمارا ہے ـــــ وہ دیس ہمارا ہے

لکھی ہے محبت کی
تاریخ نئی جس نے
روکے ہیں اندھیروں کے
طوفان کئی جس نے
جو شان بڑھائے گا
ساحل کے نظاروں کی

وہ دیس ہمارا ہے ـــــ وہ دیس ہمارا ہے

(قتیل شفائی)

مشق

۱۔ دو چیزوں میں جب کوئی صفت مشترک ہو، لیکن اپنی حقیقت میں وہ چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو اس صفتِ مشترک کو سامنے رکھ کر جب ہم ان چیزوں میں کوئی مشابہت ظاہر کریں تو اسے اِصطلاح میں تشبیہ کہتے ہیں۔ مثلاً اسلم بہادری میں شیر کی مانند ہے۔ اسلم انسان ہے اور شیر حیوان، اپنی حقیقت میں دونوں مختلف ہیں لیکن ان میں ایک صفت یعنی "بہادری" مشترک ہے اور اسی کی بنا پر اسلم کو شیر کی مانند ظاہر کیا گیا ہے۔ آج کی نظم میں کئی جگہ تشبیہیں آئی

سیّد سلیمان ندوی

۱۹۰۷ء کی بات ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں جلسہ تقسیم اسناد اور دستار بندی کی تقریب تھی۔ ناظرین کی بھاری تعداد موجود تھی۔ شرکائے جلسہ میں عام لوگوں کے علاوہ قدیم وجدید علوم کے ماہرین اور اساتذہ بھی موجود تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کے بعض شاگردوں کی مختلف موضوعات پر تقاریر تھیں۔ ایک نوجوان اپنی تقریر میں علوم جدیدہ و قدیمہ کا موازنہ کر رہا تھا۔ تقریر کے دوران ہی حاضرین جلسہ میں سے کسی نے کھڑے ہو کر کہا کہ اگر یہ مقرر عربی میں تقریر کرے تو بلاشبہ ہم ندوہ کی تعلیمی کرامات کا یقین کریں گے۔ اسی دوران میں مولانا شبلی نے حاضرین سے موضوع بھی منتخب کرنے کو کہا۔ صدر جلسہ نے موضوع منتخب کیا اور اس نوجوان نے نہایت فصیح و بلیغ عربی میں فی البدیہہ ایسی مدلل اور منطقیانہ تقریر کی کہ تمام جلسہ محوِ حیرت رہ گیا۔ ہر طرف سے آفرین کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ شفیق استاد نے جوشِ مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگردِ رشید کے سر پر رکھ دیا جو شاگرد کے لیے طرۂ امتیاز بن گیا۔ یہ مقرر سیّد سلیمان ندوی تھے جو اپنے زمانے کے نامور مؤرخ، عظیم سیرت نگار، منفرد عالم اور با ذوق شاعر مشہور تھے۔

سیّد صاحب بہار کے ضلع پٹنہ میں دسنہ نامی گاؤں کے ایک مشہور سیّد گھرانے میں ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ اصل نام انیس الحسن تھا۔ بعد میں اہلِ خانہ نے رنگون کے سلیمان نامی ایک مشہور تاجر سے متأثر ہو کر انھیں بھی سلیمان ہی پکارنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مولانا نے بھی اپنا نام سیّد سلیمان بتانا اور لکھنا شروع کر دیا۔ ندوہ کی نسبت سے ہمیشہ کے لیے سیّد سلیمان ندوی نام ہوا۔ آپ کے والد حکیم سیّد ابوالحسن ایک بلند مرتبہ عالمِ دین اور ریاست اسلام پور کے شاہی طبیب بھی تھے۔ سیّد صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے بڑے بھائی سے حاصل کی۔ اس کے بعد مختلف عربی مدارس میں نامور علما سے فیض یاب ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں آپ ذہن و فکر کی آخری تربیت گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے جو برِصغیر میں اپنی قسم کی واحد دینی درس گاہ تھی۔ یہاں پر سیّد صاحب کو ہر فن کے ماہر اساتذہ سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ سیّد صاحب کو براہِ راست مولانا شبلی جیسے بے مثل ادیب، مؤرخ، فلسفی، محقق اور مفکر کی آغوشِ تربیت میسّر آئی جس سے ان کی خداداد صلاحیتوں کی ایسی نشوونما ہوئی کہ استاد اور شاگرد کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ساتھ لیا جانے لگا۔

سیّد صاحب مختلف علوم کی تحصیل سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دارالعلوم سے شائع ہونے والے رسالہ "الندوہ" کے نائب مدیر مقرر کیے گئے۔ رسالہ میں ان کے شائع ہونے والے مضامین اتنے مقبول ہوئے کہ ان کے مضامین کا بھی لوگوں کو اسی قدر شدّت سے انتظار رہنے لگا جس بے تابی سے خود علامہ شبلی کے مضامین کا انتظار ہوتا تھا۔ اسی دوران دارالعلوم ندوۃ العلماء میں علم الکلام اور جدید عربی کے ایک استاد کی ضرورت پڑی تو علامہ شبلی کی نظرِ انتخاب اپنے اسی نوجوان اور پختہ علم شاگرد پر پڑی اور سیّد صاحب کو اپنا معاون پروفیسر مقرر کیا۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی اپنی مایہ ناز تصنیف سیرۃ النبیؐ لکھنے میں مصروف تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس عظیم تصنیف کی تکمیل بھی سیّد صاحب نے ہی کی۔

۱۹۱۱ء میں جب ملکی سیاست میں اتحادِ اسلامی کی ضرورت پیش آئی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے شائع ہونے والے اپنے ہفت روزہ اخبار "الہلال" کے لیے سیّد صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ کچھ عرصہ کے لیے سید صاحب علمی مصروفیتیں چھوڑ کر "الہلال" کے لیے دینی، تمدّنی، سیاسی اور تاریخی مضامین لکھنے کلکتہ چلے گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اخبار نے خوب ترقی کی اور سیّد سلیمان ندوی کے سیاسی اور دینی مضامین نے نوجوان مسلمانوں میں بیداری کی نئی روح پھونک دی۔ جلد ہی مولانا شبلی نعمانی نے سیّد سلیمان ندوی کو دکن کالج پونہ میں فارسی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ اس طرح "الہلال" سے علیحدہ ہو گئے۔ لیکن دو ہی سال بعد اپنے شفیق استاد کی بیماری اور وفات کی وجہ سے پونہ سے اعظم گڑھ چلے گئے جہاں علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کے علاوہ تحقیق اور مطالعہ کا وہ عظیم کام کیا جس کی وجہ سے ان کا نام بحیثیت ایک محقق اور مؤرّخ رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

سیّد صاحب کو علمی اور تحقیقی کاموں سے بہت کم وقت ملتا تھا۔ وہ سیاسیات سے بڑی حد تک گریز کرتے تھے لیکن اس کے باوجود احباب کے اصرار پر کلکتہ میں مجلسِ علماء بنگال کے اجلاس کی صدارت فرمائی اور انگریزوں کے جبر و تشدّد کے باوجود ایسا خطبہ دیا کہ لوگوں کے دلوں سے انگریز کا رعب اُٹھ گیا۔ اس کے بعد وفدِ خلافت کے ساتھ علمائے ہند کے نمائندہ کی حیثیت سے یورپ تشریف لے گئے۔ کلکتہ میں جمعیت العلماء ہند کے اجلاس میں آپ کا خطبۂ صدارت مسلمانوں کی سیاست میں ایک یادگار خطبہ سمجھا جاتا ہے۔

سیّد سلیمان ندوی کو مشاغلِ درس و تدریس کے علاوہ جو وقت بھی ملتا وہ تصنیف و تالیف میں ہی صرف ہوتا۔ سیرۃ النبیؐ جو علامہ شبلی نعمانی کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس کی دو ہی جلدیں لکھی گئی تھیں کہ مولانا وفات پا گئے لیکن اُنھیں اس کتاب کی تکمیل کا اس قدر خیال اور اشتیاق تھا کہ وفات سے قبل اپنے خوش قسمت شاگرد سلیمان ندوی کو بلا کر اپنی زندگی کی آخری خواہش یعنی سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کا اظہار کیا اور تمام مسوّدے سیّد صاحب کے حوالے کر دیے۔ سیّد صاحب نے سالہا سال کی محنت

اور کاوش کے بعد سیرت کے چار حصّے اور لکھ کر کتاب مکمل کی۔ یہ ان کا عظیم علمی کارنامہ ہے۔ سیرت اور سوانح رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دو جلدوں میں مکمّل ہے۔ تیسری جلد میں دلائل اور معجزات ہیں۔ چوتھی جلد میں اسلام کے بنیادی عقاید بیان کیے گئے ہیں جن میں نبوّت، وحی، ملائکہ سزا و جزا، جنّت و دوزخ وغیرہ مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ پانچویں جلد عبادات سے متعلق ہے۔ اس میں اسلامی عبادات کی خصوصیات اور ان کے اعتدال اور توازن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر جسمانی عبادت یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کی تفصیل اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ اس کے بعد قلبی عبادات مثلاً تقویٰ، اخلاص، توکّل، صبر و شکر وغیرہ کا ذکر ہے۔ چھٹی جلد اخلاقیات کے موضوع پر ہے جس کا تعلق زیادہ تر حقوق العباد سے ہے۔ اس میں اسلامی اخلاق کے امتیازی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ شبلی نعمانی کی پہلی دو جلدوں کے بعد سیّد سلیمان ندوی کی باقی چار جلدوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرت النبیؐ جدید علم الکلام کی نہایت معرکہ آراء کتاب ہے۔ دوسری تصنیف "خطباتِ مدراس" کے نام سے شائع ہوئی جو سیّد صاحب کے آٹھ خطبوں پر مشتمل ہے اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے سیرت کی کئی کتابوں سے بہتر ہے۔ سیرت کے موضوع پر "سیرت حضرت عائشہؓ" سیّد صاحب کی تیسری کتاب ہے۔ یہ کتاب بظاہر حضرت عائشہؓ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے، لیکن یہ بھی ایک لحاظ سے سیرت النبیؐ کی ایک کڑی ہے۔ "ارض القرآن" میں غیر مسلموں کے اعتراضات کے جواب اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق تفصیل سے درج ہے۔ سیّد صاحب نے "عرب و ہند کے تعلقات" لکھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بعض غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر پیدا کر دی تھیں۔

نامور مسلمان فلسفی، جلیل القدر عالم اور نجوم و ریاضیات کے ماہر عمر خیام کو انگریزوں نے ایک عیّاش اور مے خوار فرد کے رُوپ میں پیش کیا تھا۔ سیّد صاحب نے ایک محققانہ کتاب "خیام" شائع کی جس میں اہلِ یورپ کی تحقیق کو سراسر غلط ثابت کیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے سیّد سلیمان ندوی کی وسعتِ مطالعہ، تاریخی معلومات اور محققانہ بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ سیّد صاحب نے "حیاتِ شبلی" لکھ کر اپنے شفیق اُستاد کی خدمت میں ایک نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنا پُورا زورِ قلم اور تصنیفی کمال صرف کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب بھی کسی نے مولانا شبلی کی سوانح حیات لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اُنھوں نے حوصلہ افزائی نہ کی۔ ایک مرتبہ شاگردِ رشید سیّد سلیمان ندوی کو لکھا کہ "دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے تم ہی جب دنیا کے دوسرے کاموں سے فرصت پانا تو اس کام کو انجام دینا۔" اس وجہ سے شبلی مرحوم کی زندگی کے حالات کی ترتیب ہمیشہ سیّد صاحب کے پیشِ نظر رہی اور یہ کتاب لکھنے کا موقع بھی اس وقت ملا جب وہ دنیا کے دیگر کاموں سے بہت حد تک فرصت پا چکے تھے

"حیاتِ شبلی" سید صاحب کی آخری تصنیف ہے جس کے ساتھ ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

سید سلیمان ندوی مختلف مواقع پر جو مضامین، مقالات اور خطبات لکھتے رہے وہ مختلف رسائل میں بھی چھپتے رہے اور کچھ کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ان میں سے مکتوبِ فرنگ، سیرِ افغانستان، نقوشِ سلیمانی، یادِ رفتگان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

سید صاحب کو سیرت نگاری، تاریخ نگاری، مضمون نویسی، مقالات نگاری اور خطبات کے علاوہ اردو، فارسی، اور عربی زبان میں شعر و شاعری سے بھی دل بستگی تھی۔ وہ جس طرح نثر کے ذریعے سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مخالفین سے اس کی مدافعت کرتے تھے اسی طرح اُنھوں نے اپنی شاعری سے بھی اسلام کی اشاعت اور مدافعت کا کام لیا ہے۔ اردو، فارسی کی نسبت عربی میں سید صاحب کا منظوم کلام اتنا زیادہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں دیوان کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

برِصغیر پاک و ہند کی مردم خیز زمین کو جن مسلمان مشاہیر کے پیدا کرنے کا فخر حاصل ہے، ان کی تعداد اگرچہ کم نہیں ہے لیکن ان میں ایسے بلاشبہ کم ملیں گے جن کی عظمت کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی اپنے ہم عصر علماء فضلا نے کیا ہو۔ حقیقت میں عظیم شخص وہی ہوتا ہے جو اپنی خدا داد صلاحیتوں کی وجہ سے شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے اور حیاتِ مستعار گزار کر جب اس عالمِ فانی سے رخصت ہو تو صفحۂ ہستی پر ایسے نقوش چھوڑ جائے جو اہلِ دنیا کے لیے چشمۂ فیض اور شمعِ ہدایت کا کام دیں۔ ایسی ہی خوش قسمت ہستیوں کو قدرت کی طرف سے حیاتِ جاوید عطا ہوتی ہے اور وہ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی بھی ان ہی چند جلیل القدر شخصیات میں شامل ہیں جنھیں یہ عظمت حاصل ہوئی ہے۔ سید صاحب کی شخصیت اور ان کی سیرت و اخلاص کے بارے میں ان کی زندگی میں اور ان کی وفات پر عالمِ اسلام میں جس خلوص اور فراخ دلی سے ان کی علمیت، فضیلت اور عظمت کا اعتراف کیا گیا وہ سید صاحب کی شخصیت کے لیے بہت بڑا خراجِ تحسین ہے۔

علامہ اقبال مرحوم سید صاحب کے گہرے رفقاء میں شامل تھے۔ "مکاتیبِ اقبال" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے مختلف مسائل میں سید صاحب سے ہی استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح عالمِ اسلام کے دیگر مشاہیر نے بھی ان کو ایک بڑا محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم اور مؤرخ تسلیم کیا ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کو "ڈاکٹر آف لٹریچر" کی سند دی اور دیگر بیشتر یونیورسٹیوں نے اپنا مشیر و معاون مقرر کیا۔

سید صاحب ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے بھارت سے کراچی تشریف لائے جہاں وہ مجلسِ قانون ساز کے اسلامی تعلیمات کے بورڈ کے صدر نامزد ہوئے۔ چند دن بیمار رہ کر ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو آپ انتقال فرما گئے۔

چچا چھکّن نے تصویر ٹانگی

چچا چھکّن کبھی کبھار کوئی کام اپنے ذمّے کیا لے لیتے ہیں گھر بھر کو تگنی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ آبے لونڈے، جابے لونڈے، یہ کیجو وہ دیجو، گھر بازار ایک ہو جاتا ہے۔ دُور کیوں جاؤ پرسوں پرلے روز کا ذکر ہے دکان سے تصویر کا چوکھٹا لگ کر آیا۔ اس وقت تو دیوان خانے میں رکھ دی گئی، کل شام کہیں چچی کی نظر اس پر پڑی۔ بولیں "چھٹّن کے ابّا! تصویر کب سے رکھی ہوئی ہے، خیر سے بچّوں کا گھر ٹھہرا، کہیں ٹوٹ پھوٹ گئی تو بیٹھے بٹھائے روپے دو روپے کا دھکّا لگ جائے گا، کون ٹانگے گا اس کو؟"

"ٹانگتا اور کون، میں خود ٹانگوں گا۔ کون سی ایسی جوئے شیر لانی ہے، رہنے دو، میں ابھی سب کچھ خود ہی کیے لیتا ہوں" یہ کہنے کے ساتھ ہی شیروانی اتار چچا تصویر ٹانگنے کے درپے ہو گئے۔ امامی سے کہا —— "بیوی سے دو آنے پیسے لے کر میخیں لے آنا" ادھر وہ دروازے سے نکلا۔ اُدھر مُودے سے کہا —— "مُودے، مودے! جانا امامی کے پیچھے، کہیو تین تین انچ کی ہوں میخیں۔ بھاگ کر جا۔ جالیجو اُسے راستے ہی میں"۔

لیجیے تصویر ٹانگنے کی داغ بیل پڑ گئی۔ اور اب آئی گھر بھر کی شامت! ننّھے کو پکارا —— "او ننّھے جانا ذرا میرا ہتھوڑا لے آنا" —— "بنّو جاؤ اپنے بستے میں سے چفتی بھی نکال لاؤ —— اور سیڑھی کی ضرورت بھی تو ہوگی ہم کو —— ارے للّو ذرا تم جاکر کسی سے کہہ دیتے، سیڑھی یہاں لاکر لگا دے اور ہاں دیکھنا وہ لکڑی کے تختے والی کرسی بھی لیتے آتے تو خوب ہوتا۔ چھٹّن بیٹے چائے پی لی تم نے؟ ذرا جانا تو اپنے ان ہمسائے میر باقر علی کے گھر۔ کہنا ابّا نے سلام کہا ہے اور پوچھا ہے آپ کی ٹانگ اب کیسی ہے؟ اور کہیو وہ جو ہے نا آپ کے پاس، کیا نام ہے اس کا —— اے لو بھول گیا۔ پلول تھا کہ تلول اللہ جانے کیا تھا، خیر وہ کچھ ہی تھا —— تو یوں کہہ دیجو —— کہ وہ جو آپ کے پاس آلہ ہے نا، جس سے سیدھ معلوم ہوتی ہے، وہ ذرا دے دیجیے۔ تصویر ٹانگنی ہے، جاؤ میرے بیٹے۔ پر دیکھنا سلام ضرور کہنا اور ٹانگ کا پوچھنا نہ بھول جانا۔ اچھا! - یہ تم کہاں چل دیے للّو، کہا جو ہے ذرا یہیں ٹھہرے رہو۔ سیڑھی پر روشنی کون دکھائے گا ہم کو؟ آ گیا امامی؟ لے آیا میخیں؟ مُودا مل گیا تھا؟ تین تین انچ کی ہیں نا؟ بس بہت ٹھیک ہیں۔ اے لو —— سُتلی منگوانے کا تو خیال ہی نہ رہا! اب کیا کروں؟ جانا میرے

بھائی جلدی سے ہوا کی طرح جا، اور دیکھیو بس گز سوا گز ہو سُتلی، نہ بہت موٹی ہو نہ پتلی۔ کہہ دینا تصویر ٹانگنے کو چاہیے ہے ــــ ہے آیا؟ اور ودّو! ودّو کہاں گیا؟ ودّو میاں! اسی وقت سب کو اپنے اپنے کام کی سوجھی ہے۔ یوں نہیں کہ آکر ذرا ہاتھ بٹائیں۔ یہاں آؤ تم کرسی پر چڑھ کر مجھے تصویر پکڑانا ......"

لیجیے صاحب خدا خدا کرکے تصویر اٹھانے کا وقت آیا مگر ہونی شُدنی چچا اُسے اٹھا کر ذرا وزن کر رہے تھے کہ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گر کر شیشہ چور چور ہو گیا ــــ "ہئی ہے" کہہ کر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چچا نے کچھ خفیف ہو کر کرچوں کا معائنہ شروع کر دیا۔ وقت کی بات، اُنگلی میں شیشہ چُبھ گیا، خون کی تلّی بندھ گئی۔ تصویر کو بھول اپنا رومال تلاش کرنے لگے۔ رومال کہاں سے ملے، رومال تھا شیروانی کی جیب میں! شیروانی اتار کر نہ جانے کہاں رکھی تھی۔ اب جناب گھر بھر نے تصویر ٹانگنے کا سامان تو طاق پر رکھا اور شیروانی کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ چچا میاں کمرے میں ناچتے پھر رہے ہیں۔ کبھی اس سے ٹکر کھاتے ہیں کبھی اُس سے ــــ "سارے گھر میں کسی کو توفیق نہیں کہ میری شیروانی ڈھونڈ نکالے۔ عمر بھر ایسے نکموں سے پالا نہ پڑا تھا۔ اور کیا جھوٹ کہتا ہوں کچھ؟ چھ چھ آدمی ہیں اور ایک شیروانی نہیں ڈھونڈ سکتے جو ابھی پانچ منٹ بھی تو نہیں ہوئے میں نے اتار کر رکھی ہے۔ بھئی بڑے ......"

اتنے میں آپ کسی جگہ سے بیٹھے بیٹھے اُٹھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ شیروانی پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں ــــ "ارے بھائی رہنے دینا۔ مل گئی شیروانی، ڈھونڈ لی ہم نے۔ تم کو تو آنکھوں کے سامنے بیل بھی کھڑا ہو تو نظر نہیں آتا ــــ"

آدھے گھنٹے تک اُنگلی بندھتی بندھاتی رہی۔ نیا شیشہ منگوا کر چوکھٹے میں جڑا اور تمام قصّے طے کرنے پر دو گھنٹے بعد پھر تصویر ٹانگنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اوزار آئے ــــ سیڑھی آئی۔ چوکی آئی۔ شمع لائی گئی۔ چچا جان سیڑھی پر چڑھ رہے ہیں اور گھر بھر (جس میں ماما اور کہاری بھی شامل ہیں) نیم دائرے کی صورت میں امداد دینے کو کیل کانٹے سے لیس کھڑا ہے۔ دو آدمیوں نے سیڑھی پکڑی تو چچا جان نے اس پر قدم رکھا، اُوپر پہنچے، ایک نے کرسی پر چڑھ کر میخیں بڑھائیں ایک قبول کر لی۔ دوسرے نے ہتھوڑا اُوپر پہنچایا۔ سنبھالا ہی تھا کہ میخ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ کھسیانی آواز میں بولے ــــ "اے لو، اب کمبخت میخ چھوٹ کر گر پڑی، دیکھنا کہاں گئی؟"

اب جناب سب کے سب گھٹنوں کے بل ٹٹول ٹٹول کر میخ تلاش کر رہے ہیں۔ اور چچا میاں سیڑھی پر کھڑے مسلسل بڑبڑا رہے ہیں ــــ "ملی؟ ارے کمبختو ڈھونڈ لی؟ اب تک تو میں سو مرتبہ تلاش کر لیتا۔ اب میں رات بھر سیڑھی پر کھڑا کھڑا سوکھا کروں گا۔ نہیں ملتی تو دوسری ہی دے دو

اندھو۔" یہ سُن کر سب کی جان میں جان آتی ہے تو پہلی میخ ہی مِل جاتی ہے۔ اب میخ چچا جان کے ہاتھ میں پہنچاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں ہتھوڑا غائب ہو چکا ہے۔

"یہ ہتھوڑا کہاں چلا گیا؟ کہاں رکھا تھا میں نے؟ لاحول ولاقوۃ۔ اُلّو کی طرح آنکھیں پھاڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ سات آدمی اور کسی کو معلوم نہیں ہتھوڑا میں نے کہاں رکھ دیا؟"

بڑی مصیبتوں سے ہتھوڑے کا سراغ نکالا اور میخ گاڑنے کی نوبت آئی۔ اب آپ یہ بھول بیٹھے ہیں کہ ماپنے کے بعد میخ گاڑنے کو دیوار پر نشان کس جگہ کیا تھا؟ سب باری باری کرسی پر چڑھ کر کوشش کر رہے ہیں کہ شاید نشان نظر آجائے۔ ہر ایک کو الگ الگ جگہ نشان دکھائی دیتا ہے۔ چچا سب کو باری باری "اُلّو۔ گدھا" کہہ کر کرسی سے اُتر جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ آخر پھر چھتی لی اور کونے سے تصویر ٹانگنے کی جگہ کو دوبارہ ماپنا شروع کیا۔ مقابل کی تصویر کونے سے پینتیس۳۵ انچ کے فاصلے پر لگی ہوئی تھی۔ "بارہ اور بارہ اور کے انچ اور؟" بچوں کو زبانی حساب کا سوال مِلا۔ باآوازِ بلند حل کرنا شروع کر دیا اور جواب نکلا تو کسی کا کچھ تھا اور کسی کا کچھ! ایک نے دوسرے کو غلط بتایا۔ اِسی تو تو مَیں مَیں میں سب بھول بیٹھے کہ اصل سوال کیا تھا۔ نئے سرے سے ماپ لینے کی ضرورت پڑ گئی۔

اب کے چچا چھتی سے نہیں ماپتے۔ سُتلی سے ماپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سیڑھی پر پینتالیس درجے کا زاویہ بنا کر سُتلی کا سِرا کونے تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سُتلی ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ آپ لپک کر اسے پکڑنا چاہتے ہیں کہ اس کوشش میں زمین پر آ رہتے ہیں۔ کونے میں ستار رکھا تھا۔ اس کے تمام تار چچا جان کے بوجھ سے یک لخت جھنجھنا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

اب چچا کی زبان سے جو منجھے ہوئے الفاظ نکلتے ہیں سُننے کے قابل ہوتے ہیں مگر چچی روک دیتی ہیں اور کہتی ہیں — "اپنی عمر کا نہیں تو ان بچوں ہی کا خیال کرو۔"

بہت دشواری کے بعد چچا جان ازسرِنو میخ گاڑنے کی جگہ معیّن کرتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے اس جگہ میخ رکھتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے ہتھوڑا سنبھالتے ہیں۔ پہلی ہی چوٹ جو پڑتی ہے تو سیدھی ہاتھ کے انگوٹھے پر۔ آپ "سی" کر کے ہتھوڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ نیچے آکر گرتا ہے کسی کے پاؤں پر — ہائے ہائے — اور افوہ — اور مار ڈالا شروع ہو جاتی ہے۔ چچی جل بُھن کر کہتی ہیں —

"یوں میخ گاڑنا ہُوا کرے تو مجھے آٹھ روز پہلے خبر دے دیا کیجیے۔ میں بچوں کو لے کر میکے چلی جایا کروں — اور نہیں تو —!"

چچا نادم ہو کر جواب دیتے ہیں — "یہ عورت ذات بھی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے یعنی

ہوا کیا جس پر یہ طعنے دیے جا رہے ہیں ؟ بھلا صاحب کان ہوئے آیندہ ہم کسی کام میں دخل نہ دیا کریں گے ۔۔!" اب نئے سرے سے کوشش شروع ہوئی۔ میخ پر دوسری چوٹ جو پڑی تو اس جگہ پر پلستر نرم تھا۔ پوری کی پوری میخ اور آدھا ہتھوڑا دیوار میں اور چچا اچانک میخ گڑ جانے سے اس زور سے دیوار سے ٹکرائے کہ ناک غیرت والی ہوتی تو پچک کر ہی رہ جاتی۔

اس کے بعد ازسرِ نو چھپتی اور رسّی تلاش کی گئی اور میخ گاڑنے کی نئی جگہ مقرّر ہوئی۔ اور کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا کہ خدا خدا کر کے تصویر ٹنگی۔ وہ بھی کیسی، ٹیڑھی، بنکی اور اتنی جھکی ہوئی کہ جیسے اب سر پر آئی کہ اب سر پہ آئی۔ چاروں طرف گز گز بھر دیوار کی یہ حالت گویا چاند ماری ہوتی رہی ہے۔ چچا کے سوا باقی سب تھکن سے چُور نیند میں جھوم رہے ہیں۔ اب آخری سیڑھی پر سے دھم سے جو اترتے ہیں تو کہاری غریب کے پاؤں پر پاؤں! غریب کے ڈیل بھی تڑپ ہی تو اُٹھی۔ چچا اس کی چیخ سن کر ذرا سراسیمہ تو ہوئے مگر پل بھر میں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے " اتنی سی بات تھی ۔۔ لگ بھی گئی۔ لوگ اس کام کے لیے مستری بلوایا کرتے ہیں"

[امتیاز علی تاج]

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے :۔

تگنی کا ناچ نچانا۔ جوئے شیر لانا۔ داغ بیل پڑنا۔ منہ تکنا۔ تلّی بندھنا۔ پالا پڑنا۔ کیل کانٹے سے لیس ہونا۔ بات کا بتنگڑ بنانا۔ جان میں جان آنا۔

۲۔ چچا چھکّن کی شخصیت کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں ؟

۳۔ تصویر ٹانگنے کے سلسلے میں چچا چھکّن نے گھر کے کس کس آدمی سے مدد لی ؟

۴۔ تصویر ٹانگنے کے لیے چچا چھکّن نے جو جو اشیا منگوائیں ان کے نام گنوائیے۔

۵۔ " تصویر " تفصیل کے وزن پر عربی مصدر ہے۔ ایسے پانچ الفاظ تلاش کر کے لکھیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل کے معنی بتائیے :۔

ہوا کی طرح جانا۔ خفیف ہونا۔ ڈھنڈیا پڑنا۔ عمر بھر۔ داغ بیل۔

۷۔ مندرجہ ذیل کی مؤنث لکھیے :۔

سیّد۔ چچا۔ ماموں۔ ابّا۔ شاہد۔

۸۔ اس سبق میں سے اسمائے آلہ چن کر لکھیے۔

۹۔ او۔ ارے۔ ابے وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو کسی کو پکارنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ انہیں قواعد میں "حروفِ ندا" کہتے ہیں۔ اس سبق میں سے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کیجیے۔

اسلامی اخوّت

ایک گھر کے اندر سے ایک عورت کی درد ناک چیخ بلند ہوتی ہے "المدد یا امیر المومنین، ایک مظلوم کی خبر لیجو۔ اس ظالم شخص سے مجھے بچائیو!" امیر المومنین کا نام سن کر گلی میں سے گذرنے والا ایک آدمی کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ گھر کے اندر سے آنے والی آوازوں پر کان لگا دیتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہاں امیر المومنین سے مدد مانگنے والا کون ہے؟ اندر سے ایک مرد کی کرخت آواز سنائی دیتی ہے۔ "خاموش اے بدبخت عورت! تیرا امیر المومنین یہاں کہاں، یہ تو روم کی سلطنت ہے۔ بغداد جہاں وہ تیرا خلیفۃ المسلمین رہتا ہے، یہاں سے دنوں نہیں بلکہ مہینوں کی مسافت پر واقع ہے۔ اچھی طرح سن لے۔ مسلمانوں کا خلیفہ اتنی دور ایک دوسری سلطنت میں جس کا حکمران ایک عیسائی شہنشاہ ہے، تیری مدد کو آنے سے رہا۔ میں تیرا آقا ہوں۔ میں نے تجھے دولت دے کو خریدا ہے۔ میں تجھے پیٹوں گا۔ تو میری کنیز ہے۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔" اتنا کہہ کر پھر بے تحاشا عورت کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ عورت کی آہ و زاری پھر بلند ہوتی ہے۔ آہوں اور سسکیوں کے درمیان اس کی امیر المومنین کو مدد کے لیے پکارنے کی آوازیں بھی آتی ہیں۔ مرد مارتے مارتے تھک جاتا ہے تو پھر عورت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ "اپنے دینی بھائی امیر المومنین کو پکارتی جا، وہ ضرور تیری آواز سن کر ہزاروں فوجیوں کے ساتھ تیری مدد کو پہنچے گا۔ یہ معمولی فوجی نہیں ہوں گے بلکہ ہر فوجی ابلق عربی گھوڑے پر سوار ہوگا۔" فریاد و فغاں کی آوازیں سن کر گلی میں اور بھی بہت سے آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ شخص جو سب سے پہلے آکر گلی کے باہر آ کھڑا ہوا تھا، ان میں سے ایک آدمی سے پوچھتا ہے۔ "یہ کس کا مکان ہے؟ اور مکان کے اندر کون آدمی ہے جو ایک بے کس عورت کو ایسی بے دردی سے پیٹتا ہے؟" وہ آدمی بتاتا ہے کہ "یہ مکان ایک یہودی تاجر کا ہے جو حال ہی میں کوئی مسلمان لونڈی کہیں سے خرید لایا ہے۔ اسے وہ ہر روز اسی بے دردی سے مارتا ہے ۔۔"

یہ واقعہ جو ہم نے آپ کو بتایا ہے، روم کے ایک شہر میں پیش آیا تھا۔ روم اس وقت ایک عیسائی شہنشاہ کی قلمرو میں تھا اس کا دار السلطنت قسطنطنیہ تھا۔ اس سلطنت کے ساتھ ساتھ بڑی دور تک اسلامی سلطنت پھیلی ہوئی تھی جس کے فرماں روا کو مسلمان امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کہتے تھے۔ بنی امیہ کے بعد اسلامی سلطنت عباسی خاندان میں منتقل ہوئی عباسی خاندان میں بڑے نامور خلفا گزرے ہیں۔ جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت خلافت اسلامیہ کے خلیفہ کا نام

المعتصم باللہ تھا۔ عباسی خاندان کا یہ چھٹا خلیفہ تھا اور مامون الرشید کی وفات پر خلافت اِسے ملی تھی۔ المعتصم کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ وہ بڑا دلیر، جری، شجاع اور طاقت ور خلیفہ تھا کچھ عرصہ پہلے وہ قیصرِ روم کو لڑائی کے میدان میں شکستِ فاش دے چکا تھا اور اس سے تاوانِ جنگ اورخراج وصول کرچکا تھا۔

روم کی عیسائی سلطنت کے اندر ایک مکان میں ایک یہودی کا ایک مسلمان عورت کو پیٹنے اور اس کا خلیفۃ المسلمین کو مدد کے لیے پکارنے کا واقعہ جو شخص مکان کے باہر کھڑا سن رہا تھا، وہ ایک مسلمان تاجر تھا جو اپنا مال فروخت کرنے کے بعد اس شہر کی سیر کو نکلا تھا اور عورت کے منہ سے المدد یا امیرالمومنین کی آواز سن کر گلی میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ عورت کی فریاد، بے کسی اور آہ وزاری سے یہ تاجر بڑا متأثر ہُوا۔ اس نے اسی دن اس شہر سے رختِ سفر باندھا اور نہایت تیزی سے سفر کرتا ہُوا بغداد پہنچا۔ تاجر بغداد ہی کا رہنے والا تھا۔ بغداد میں داخل ہونے کے بعد اپنے گھر جانے کی بجائے اس نے خلیفۃ المسلمین کے دربار کی راہ لی۔ باریابی کا حکم ملتے ہی وہ المعتصم کے دربار میں پہنچا۔ شاہی آداب بجا لانے کے بعد اس نے روم کے ایک شہر میں ایک مکان کے اندر سے جو کچھ سُنا تھا مِن وعَن بیان کر دیا۔ خلیفہ نے جب یہ سب ماجرا سُنا۔ بے اختیار پکار اُٹھا۔ "میری بہن! تونے اپنے بھائی کو مدد کے لیے پکارا ہے۔ تیرا بھائی فوراً تیری مدد کو پہنچے گا۔ اور سُن او یہودی کتے! میں اپنی بہن کی مدد کے لیے چالیس ہزار ابلق گھوڑے سواروں کے ساتھ پہنچ رہا ہوں۔" پھر سپہ سالار کو حکم دیا کہ مجھے چالیس ہزار ابلق سوار لشکر کے ساتھ بغداد سے روم جانے والی شاہراہ کی پہلی منزل پر ملو۔ میں اپنی بہن کی مدد کے لیے آج اور ابھی روانہ ہونا چاہتا ہوں۔ میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔ فوراً فوج کے ساتھ پہنچو۔" یہ کہہ کر المعتصم دربار سے اٹھ گیا اور مختصر تیاری کے بعد روم کی طرف کوچ کیا۔

سپہ سالار کے لیے چالیس ہزار ابلق گھوڑے پیدا کرنے مشکل تھے۔ خلیفہ کے پاس فوج اور عام گھوڑوں کی کمی تو نہ تھی لیکن ابلق رنگ کا گھوڑا جہاں خوش نما ہوتا ہے وہاں بڑا قیمتی بھی ہوتا ہے۔ اس وقت بغداد کی چھاؤنی میں اتنی بڑی تعداد میں ابلق گھوڑے موجود نہ تھے لیکن حکم اور پھر المعتصم جیسے باجبروت خلیفہ کا حکم تھا۔ سپہ سالار نے نہایت سُرعت سے چالیس ہزار ابلق گھوڑے مہیا کیے اور پھر اس لشکرِ جرار کے ساتھ بغداد سے آگے ایک منزل کی مسافت پر خلیفہ المعتصم کو جا ملا۔

خلیفہ بڑی شدت سے اپنی فوج کا انتظار کر رہا تھا۔ جوں ہی فوج پہنچی، اس نے روم کی سرحدوں کی طرف کوچ شروع کر دیا۔ قیصرِ روم کے جاسوسوں نے اِسلامی فوج کی نقل وحرکت

سے شہنشاہِ روم کو آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ اِس لشکر کی کمان خود خلیفہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس عظیم لشکر کے ساتھ روم کی سرحدوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسلامی فوج ہر قسم کے اسلحہ سے لیس ہے اور اس کے تیور بھی اچھے نہیں دکھائی دیتے۔

قیصر روم نے غیر متوقع طور پر جب اسلامی لشکر کی روم کی سرحدوں کی طرف بڑھنے کی خبر سُنی تو بڑا دل گرفتہ ہُوا۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی وہ خلیفہ المعتصم سے ایک لڑائی میں شکست کھا کر تاوانِ جنگ اور خراج دے چکا تھا۔ اس نے فوراً اپنے سفیر خلیفہ المعتصم کی خدمت میں بھیجے جنھوں نے قیصرِ روم کی طرف سے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں یہ عرض داشت پیش کی کہ جنگ کے بعد ہماری طرف سے صلح نامے کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ پھر آپ کیوں لشکرِ جرّار کے ساتھ ہماری سرحدوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

امیر المومنین المعتصم باللہ نے قیصرِ روم کے سفیروں کو جواب دیا کہ ہم روم کی سلطنت پر چڑھائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم تو صرف آپ کی سلطنت کے ایک شہر میں اپنی مظلوم بہن کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ اس بہن نے دُکھ اور تکلیف سے مجبور ہو کر ہمیں آواز دی۔ وہ آواز ہمارے کانوں میں پہنچی تو ہم اس کی مدد کے لیے چل پڑے۔ قیصرِ روم کے سفیروں نے عرض کیا کہ آپ کے ارشادات ہم فوراً قیصر روم تک پہنچاتے ہیں۔ آپ ان کے جواب کا انتظار کیجیے۔

جب قیصرِ روم کو اس کے سفیروں نے اصل حالات سے آگاہ کیا تو وہ بڑا متعجب ہُوا، فوراً ایک قاصد خلیفۃ المسلمین المعتصم کی خدمت میں بھیج کر عرض کیا کہ "آپ وہیں انتظار فرمائیے ہم اس یہودی اور اس قابلِ احترام خاتون کو حفاظت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پہنچاتے ہیں"۔ دُوسری طرف اس نے اپنے ایک چاق و چوبند فوجی دستہ کو حکم دیا کہ فلاں شہر کے فلاں مکان سے مکان کے یہودی مالک اور اس کی کنیز کو فوراً روم کی سرحدوں کے باہر المعتصم کے پاس پہنچا دو۔ یہ بات یاد رکھنا کہ اس کنیز کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ اور یہودی کو پابجولاں، المعتصم کے سامنے پیش کیا جائے"۔

عباسی خلیفہ ابھی روم کی سرحدوں سے دور ہی تھا کہ قیصرِ روم کا چاق و چوبند فوجی دستہ کنیز اور یہودی کو لیے حاضر ہُوا۔ خلیفہ نے کنیز کو دیکھا تو کہا، "میری بہن تو نے ہمیں پکارا تو ہم نے تیری آواز سنی۔ ہم تیری مدد کو آ پہنچے ہیں"۔ اور یہودی کی طرف دیکھ کر کہا، "سن او یہودی! تو نے میری بہن کو طعنہ دیا تھا کہ امیر المومنین ہزاروں ابلق گھوڑ سواروں کے ساتھ تیری مدد کو پہنچے گا۔ سو دیکھ لے ہم چالیس ہزار ابلق گھوڑوں کے ساتھ اپنی بہن کی مدد کو آئے ہیں"۔

بڑا قابلِ دید منظر تھا۔ عورت کی آنکھوں میں تشکّر کے آنسو تھے۔ یہودی شرمندگی اور خجالت سے

پانی پانی ہو رہا تھا اور اسی عالم میں وہ پکار اُٹھا: "یا امیرالمومنین! اسلام کے اس بھائی چارے اور اسلامی اخوّت کو دیکھ کو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اسلام سچّا دین ہے۔ اِس دین میں غریب اور امیر بلا اِمتیاز ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ایک ایسا فرماں روا جو آج دنیا کی سب سے طاقت و سلطنت کا مالک ہے ایک کنیز کو اپنی بہن سمجھ کر اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ آپ گواہ رہیں۔ میں خداوند تعالیٰ اور اس کے آخری نبیؐ پر ایمان لاتا ہوں۔ میں نے اپنی اس کنیز پر جو آپ میری دینی بہن ہے، بڑا ظلم کیا ہے۔ میں اِسے آزاد کرتا ہوں اور اِس سے معافی مانگتا ہوں۔ اب آپ میرے قصور کی جو چاہیں سزا دیں۔" المعتصم اِس نومسلم اور خاتون کو لے کر بغداد کو واپس چل دیا۔

تاریخ اسلام میں اسلامی اخوّت کا یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے، ورنہ مسلمانوں نے اِسلامی اخوّت کے جذبے سے سرشار ہوکر جو کچھ کیا ہے اسے سُن کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ پاکستان کے قیام میں اسلامی اخوّت کا جو مظاہرہ ہُوا وہ دُنیا کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ پاکستان کے بنانے میں ان صُوبوں کے مسلمانوں نے بڑا کام کیا جو اَب بھارت کا حصّہ بن چکے ہیں۔ ان صوبوں میں مسلمان ہندوؤں سے کم تعداد میں تھے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ جب ہندوستان دو حصّوں میں تقسیم ہوگا تو وہ بھارت میں آئیں گے جہاں وہ ہندوؤں کے محکوم ہوں گے۔ ہندوستان کے ہندو اُنھیں کہتے بھی تھے کہ پاکستان بنے گا تو تمھیں کیا فائدہ ہوگا۔ تم تو بھارت میں رہو گے۔ وہ جواب دیتے۔ کیا ہُوا۔ ہمارے دُوسرے مسلمان بھائی تو آزاد ملک کے مالک ہوں گے۔ پاکستان کا قیام اِسلامی اخوّت کے جذبے سے سرشار اِن مسلمانوں کی قربانیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مَشق

۱ - امیرالمومنین کو مدد کے لیے کون پکار رہا تھا؟

۲ - کیا بغداد کے عبّاسی خلیفہ نے پکارنے والے کی آواز سنی؟

۳ - خلیفہ نے اپنی فوج کے ساتھ روم کی سرحدوں کی طرف کیوں کوچ کیا؟

۴ - اسلامی اخوّت کے متعلق آپ جو کچھ سمجھتے ہیں اُسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۵ - اسلامی اخوّت کے بارے میں آپ کو کوئی واقعہ یاد ہو تو بیان کریں۔

۶ - اس سبق میں مندرجہ ذیل الفاظ ہیں، ان کے معانی بتائیے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

خلیفۃ المسلمین۔ کنیز۔ فریاد و فغاں، نامور۔ سردست۔ متاثر۔ باجبروت۔ باہجولاں۔

عروجِ اسلام کا دور

یہ نظم مسدسِ حالی سے منتخب کی گئی ہے۔ حالی نے بتایا ہے کہ ہمارے آباؤاجداد کتنے عظیم تھے جنھوں نے تمام دنیا کو علوم و فنون اور تہذیب و تمدن دیا۔

" کیا اُمیوں نے جہاں میں اُجالا ہُوا جس سے اسلام کا بول بالا
بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا ہر اِک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا
زمانے میں پھیلائی توحید مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آوازِ حق حق

ارسطو کے مردہ فنوں کو جِلایا فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اِک شہر و قریہ کو یوناں بنایا مزا عِلم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانے کو خوابِ گراں سے

ہر اِک علم کے فن کے جویا ہُوئے وہ ہر اِک کام میں سب سے بالا ہُوئے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہُوئے وہ سیاحت میں مشہورِ دنیا ہُوئے وہ
ہر اِک ملک میں ان کی پھیلی عمارت
ہر اِک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

کیا جاکے آباد ہر مُلکِ ویراں مہیّا کیے سب کی راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں انہیں کر دیا رشکِ صحنِ گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفّا دو طرفہ برابر درختوں کا سایا
نشاں جا بجا میل و فرسنگ کے برپا سرِ رہ کنوئیں اور سرائیں مہیّا
انہیں کے ہیں سب نے یہ چربے اُتارے
اسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے

سدا ان کو مرغوب سیر و سفر تھا ہر اِک برِّاعظم میں اُن کا گذر تھا
تمام ان کا چھانا ہُوا بحر و بر تھا جو لنکا میں ڈیرا تو بربر میں گھر تھا

وہ گنتے تھے یکساں وطن اور سفر کو
گھر اپنا سمجھتے تھے ہر دشت و در کو

جہاں کو ہے یاد ان کی رفتار اب تک	کہ نقش قدم ہیں نمودار اب تک
ملایا میں ہیں ان کے آثار اب تک	انہیں رو رہا ہے ملیبار اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر
نشاں ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر

نہیں اس طبق پر کوئی بحر اعظم	نہ ہوں جس میں ان کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم	بناؤ سے ہے ان کی معمور عالم
سر کوہ آدم سے تا کوہ بیضا
ملے گا جہاں جاؤ گے کھوج ان کا

وہ سنگیں محل اور وہ ان کی صفائی	جمی جن کے کھنڈروں پہ ہے آج کائی
وہ مرقد کہ گنبد تھے جن کے طلائی	وہ معبد جہاں جلوہ گر تھی خدائی
زمانے نے گو ان کی برکت اٹھا لی
نہیں کوئی ویرانہ پر ان سے خالی

(الطاف حسین)

مشق

١ نظم کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ اوپر جو نظم دی گئی ہے اسے مسدس کہتے ہیں۔ مسدس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے چار مصرعے آپس میں ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں اور آخری دو مصرعے آپس میں ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

اوپر دی ہوئی مسدس کے پہلے دو بندوں کا مطلب بیان کیجیے۔

٢۔ اس مسدس کے پانچویں اور چھٹے بند کی نثر بنائیے۔

٣۔ اس نظم میں کئی ملکوں کے نام آئے ہیں مثلاً عرب۔ ہند۔ مصر۔ لنکا۔ شام۔ دیلم۔ ملایا۔ بربر۔ یونان۔ عجم۔ ملیبار وغیرہ۔ بتائیے کہ یہ ملک کہاں کہاں واقع ہیں؟

٤۔ ان الفاظ کے معانی بتائیے۔ فنون، صحن گلستان۔ رشک۔ نقش قدم۔ بحر و بر۔

٥۔ ہمالہ کو کس کے واقعات ازبر ہیں؟ ٦۔ اس بند کی ایسی تشریح بیان کیجیے کہ مطلب واضح ہو جائے۔

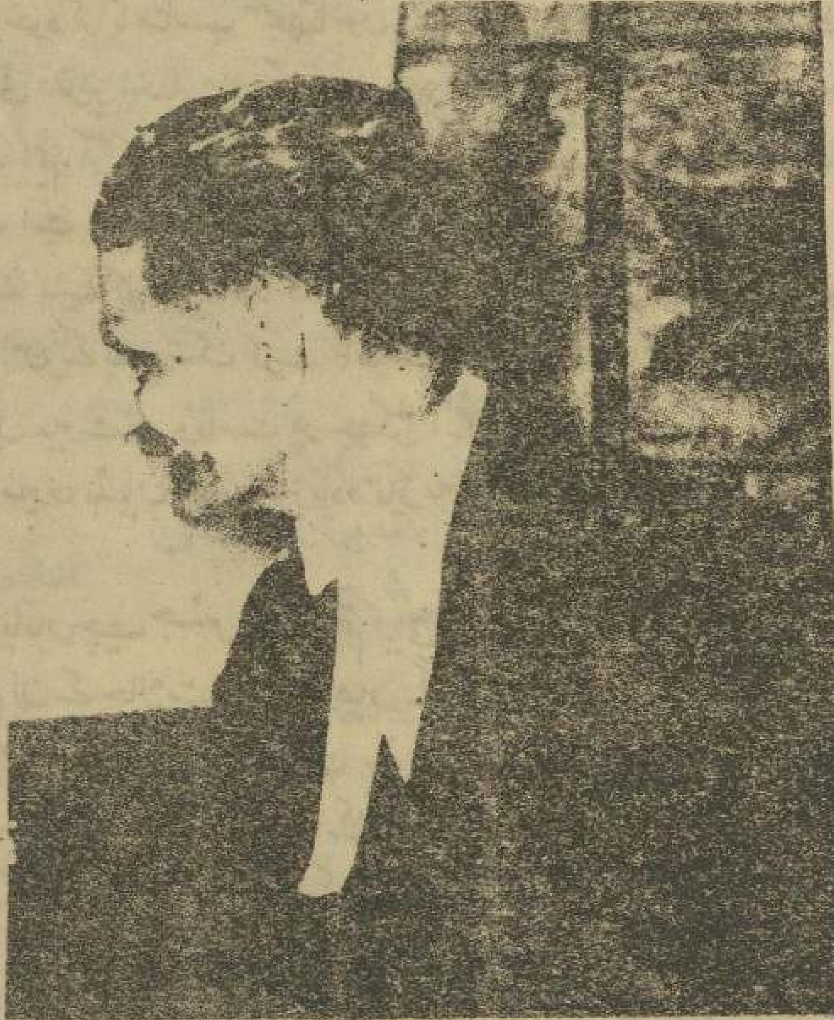
ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا	فلاطوں کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا	مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا بر طرف پردہ چشم جہاں سے
جگایا زمانے کو خواب گراں سے

چیف جسٹس محمد رستم کیانی

"میں اپنا تعارف خود کرانا مناسب سمجھتا ہوں۔ ایک نویں جماعت کے طالب علم نے مجھے خط لکھا کہ جب بھی آپ کی تقریر اخبار میں آتی ہے، گھر میں اِس بات پر بحث ہوتی ہے کہ آپ کا اصلی نام کیا ہے؟ یہ ایم۔ آر کیانی تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اسے کبھی ہم محمد رمضان سمجھتے ہیں کبھی ملک رنجیت۔ آپ اپنے ہاتھ سے لکھیں۔ آپ کا اصلی نام کیا ہے؟ تاکہ آئندہ ہمارے گھر میں یہ جھگڑا نہ ہو۔ میں نے لڑکے کو جواب دیا کہ یہ خط میں اپنے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں اور میرا نام محمّد رستم ہے۔ جو اس کے بعد شک کرے کافر ہے۔ نیز چونکہ اس کا اِحتمال ہے کہ اِس کے بعد آپ کے گھر میں میرے قد وقامت پر جھگڑا اُٹھے تو واضح ہو کہ میں خود تو بال سے زیادہ باریک ہوں مگر میری ہڈیاں تلوار سے زیادہ تیز ہیں جن پر دوغلی باتوں کے ٹرک نہیں گذر سکتے۔"

اُوپر لکھی ہوئی باتیں چیف جسٹس محمد رُستم کیانی نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہیں۔ آئندہ سطروں میں ہم ان کے حالاتِ زندگی پڑھیں گے۔ ان کی باتوں سے جو انھوں نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہیں، جہاں ہمیں اُن کے پُورے نام کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدوقامت کے لحاظ سے کوئی ہٹّے کٹّے، موٹے تازے نہیں تھے۔ بلکہ متوسّط قد کے نہایت دُبلے پتلے انسان تھے۔ محمد رُستم کیانی کے والد کا نام خان بہادر عبد الصّمد خان تھا۔ آپ سرکاری ملازم تھے اور پولیٹیکل ایجنٹ کے عہدہ پر کافی عرصہ تک کام کرتے رہے۔ آپ کے بڑے بھائی ملک الرحمٰن کیانی صوبہ سرحد میں ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ صوبہ سرحد کے وزیر صحت رہ چکے ہیں۔ محمد رُستم کیانی ایک سربرآوردہ اور تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے افراد مختلف عہدوں پر اب بھی فائز ہیں۔ آپ کا تعلق ایران کی مشہور کیانی نسل سے ہے جس میں صدیوں تک ایران کی بادشاہت رہی۔ آپ کے خاندان نے نادر شاہ درّانی کے عہد میں ہندوستان کی طرف ہجرت کی اور کوہاٹ میں مقیم ہوا۔ ضلع کوہاٹ کے گاؤں شاہ پور ہی میں آپ کی پیدائش ۱۸ر اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کوہاٹ اور پشاور میں حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے کیا اور وہاں سے ہی انگریزی ادب میں ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۲۷ء میں انڈین سِول سروس میں شامل ہوئے اور انگلینڈ کے ٹریننگ کالج کیمبرج میں گئے۔ وہاں سے

واپس ہوئے تو آٹھ سال تک انتظامیہ سے منسلک رہے۔ ۱۹۳۹ء میں انتظامیہ سے عدلیہ میں تبدیل ہو گئے اور کئی مقامات پر بطور ڈسٹرکٹ و سیشن جج کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت حکومت پنجاب کے مشیر اور محکمۂ قانون کے معتمد مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہائی کورٹ کے جج بنا دیے گئے۔ تقریباً دس سال اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ پھر مغربی پاکستان کے چیف جسٹس بنا دیے گئے اور ۱۹۵۵ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔



کیانی مرحوم ادبی دنیا میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ملازمت کے ابتدائی دور ہی سے شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے مشاہدات کو سول سروس کے سالانہ جلسوں میں پابندی کے ساتھ سنایا کرتے تھے جنھیں حاضرین نہ صرف ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے بلکہ آپ کی مخصوص انداز کی تقریروں کو نہایت ہی پسند کرتے تھے۔ سول سروس کے محدود حلقے سے آپ کی شہرت نکل کر ادبی حلقوں تک پہنچ گئی پھر تو بڑے بڑے ادبی جلسوں میں ادبی انجمنیں آپ کو مدعو کرتیں اور آپ کی تقریریں سننے کے لیے بہت زیادہ تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے۔ آپ کی تقریروں میں

مزاح کی چاشنی ہوتی۔ طنز کے تیر و نشتر ہوتے۔ جو کچھ حق سمجھتے اس کا اظہار بڑی جرأت سے کرتے۔ ان کی زبان و بیان میں کچھ ایسا لطف تھا کہ سُننے والے چاہتے تھے کہ وہ بولتے ہی رہیں۔ تقریر میں بات سے بات نکالتے اور ایسے شگوفے اور پُھل جھڑیاں چھوڑتے کہ سُننے والوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کر بل پڑ جاتے۔ محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی اور حاضرین کے قہقہوں کی آوازیں دُور دُور تک سُنائی دیتیں۔ محکموں کے بد دیانت ملازموں اور افسروں کو اپنی تقریروں میں ایسا لتاڑتے کہ توبہ ہی بھلی!۔ محکموں اور حاکموں کی نااہلی پر خُوب خُوب چوٹیں کرتے۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں تو آپ ملک کے مقبول ترین اور پسندیدہ مقرر بن گئے۔ بڑی بڑی ادبی انجمنوں کے علاوہ تعلیمی، سماجی اور فنی ادارے بھی آپ کو بڑے اصرار کے ساتھ بلاتے اور آپ کی تقریریں سُنتے۔ آپ نے اردو اور انگریزی زبانوں میں کئی عنوانات پر تقریریں کیں جنھیں ملکی اخبارات نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ پھر یہ تقریریں دو کتابوں میں یک جا کی گئیں جن کے نام "افکارِ پریشاں" اور "اوراقِ پریشاں" ہیں۔ ملازمت سے پنشن پانے کے بعد صرف ایک مہینے میں مختلف جگہوں پر چھ تقریریں کیں۔ اِس سے لوگوں میں ان کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ۱۵ رنومبر ۱۹۶۲ء کو کیانی صاحب چٹاگانگ میں اچانک انتقال کر گئے۔ وہاں وہ ایک جلسے سے خطاب کرنے گئے تھے۔ ان کی میّت کو وہاں سے ان کے آبائی گاؤں پہنچایا گیا جہاں وہ دفن ہوئے۔

کیانی صاحب کی تقریروں میں سے کچھ ہم آپ کو سُناتے ہیں تاکہ آپ کو اُن کے سلجھے ہوئے مذاق اور طنز و مزاح کا تھوڑا سا اندازہ ہو جائے۔ ایک دفعہ ان لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہا، جو صرف اقتدار کو سلام کرتے اور اقتدار پرستی کرتے ہیں۔ "ایک رسالے کے مدیر نے ایک بار مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، اس نے لکھا کہ وہ مختلف مسائل کے متعلق میرے خیالات معلوم کر کے اپنے رسالے میں شائع کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے لکھا کہ تھوڑے عرصے تک میں اپنی میعادِ ملازمت ختم کر کے گھر چلا جاؤں گا۔ گاؤں میں ایک چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر گلابوں میں پیوند لگایا کروں گا۔ اگر اس وقت بھی مدیر صاحب مجھے اِس قابل سمجھیں کہ دنیا کے اہم مسائل کے متعلق میری رائے پوچھیں تو مجھے لطف آئے گا، اِس وقت تو میری رائے سرکاری ہوگی۔ مدیر صاحب نے پھر نہیں پوچھا اور نہ گاؤں میں پوچھیں گے۔" کیانی صاحب کو اس بات سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ لوگ جب کسی کو اقتدار یا بڑے عہدے پر دیکھتے ہیں تو اس کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے ہیں۔

ایک جگہ قائدِ اعظمؒ بانیٔ پاکستان کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں کہتے ہیں: "سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور پھر کئی صدیاں چھوڑ کر اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ پر نگاہ ٹھہری ہے۔ میں

۱۹۴۶ء میں گرمیوں میں شملہ گیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان بننے کے پہلے کا وہ زمانہ کس طرح ہنگاموں سے بھرا ہوا تھا۔ قائدِاعظمؒ بھی ان دنوں کسی کانفرنس کے سلسلے میں وہیں تھے۔ مدّت سے میری آرزو تھی کہ قائدِاعظمؒ سے مِلوں۔ چنانچہ میں رکشا میں بیٹھ کر ان کے مکان پر گیا۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ میں جب ان سے ملا تو میں نے ان کو مفید مشورہ دیا جس پر اُنہوں نے فرمایا کہ آپ مجھے دو سال پہلے ملے ہوتے تو پاکستان بن گیا ہوتا، تو آپ مان لیں گے۔ اور کئی لوگوں نے آپ سے ایسی باتیں منوائی ہوں گی کیونکہ قائدِاعظمؒ تو اب ان کی تردید نہیں کرسکتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں جب ان سے ملنے گیا تو وہ مجھ سے نہ ملے۔ اور میرے دل میں ان سے مِلنے کی حسرت رہ گئی۔ میں نے ان کے سیکرٹری کو بتایا کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے پوچھا کوئی کام ہے۔ میں نے کہا کہ کام تو کچھ نہیں۔ صرف تمنائے زیارت کھینچ لائی ہے۔ اس نے کہا۔ پھر وہ آپ سے نہیں مِلیں گے۔ میں نے کہا۔ آپ میرا کارڈ تو لے جائیں۔ میرا خیال تھا کہ میرا آئی۔ سی۔ ایس کا کارڈ دیکھ کر سمجھ جائیں گے کہ میں محض شاعر نہیں۔ مگر کیا پتہ کہ سیکرٹری نے کارڈ دکھایا یا نہیں۔ اگر نہیں دکھایا خدا اُسے بخشے۔ واپس آکر اس نے کارڈ کے ساتھ مجھے بھی واپس کردیا۔ میں باہر نکل کر محسوس کرنے لگا جیسے کسی سے کہا جائے کہ تم نوکری سے ڈسمس کر دیئے گئے ہو۔ کچھ دیر کھڑا رہا تاکہ چکرؔ کی کیفیت پر قابو پالوں۔ پھر رکشا کی طرف چلا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ رکشا میں سوار کوئی ان کے گھر سے نکلا۔ اخباروں میں جو تصویریں نکلا کرتی تھیں اُن سے میں نے پہچان لیا کہ یہی قائدِاعظمؒ ہیں۔ میرا پژمردہ چہرہ ایک دم تازہ ہوگیا اور میں نے وفورِ شادمانی میں بڑے اشتیاق سے سلام کیا۔ انہوں نے ایک کشادہ تبسّم سے میرے سلام کا جواب دیا۔ بس میں سمجھا کہ میری زیارت ہوگئی۔"

محمد رُستم کیانی کی تقریر کے اِس حصّے کو غور سے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے بڑھ بڑھ کر ڈینگیں مارنے والے شیخی خوروں پر کیسی چوٹ کی ہے جو بڑے آدمیوں سے اپنی ملاقات کے جھوٹے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور ان قصّوں میں اپنی عقل مندی کا جھوٹا راگ اپنے منہ سے الاپتے نہیں تھکتے۔ پھر ان کی اِس تقریر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قائدِاعظمؒ کے پاس وقت کی کتنی قدر تھی کہ وہ بغیر کام کے کسی سے نہیں ملتے تھے۔ اگر کسی کو ان سے کام ہوتا تو وہ مِل لیتے۔ لیکن ایسے لوگوں سے جو صرف انہیں دیکھنے کی غرض سے جاتے، وہ قطعی نہیں ملتے تھے اور اسے اپنے اور دُوسروں کے قیمتی وقت کا ضیاع سمجھتے تھے۔ ان کی اِس تقریر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے راست گو اور سچّے تھے اور قائدِاعظمؒ سے کس قدر محبّت کرتے تھے کہ ان کے نہ مِلنے پر پژمردہ ہوگئے، لیکن جب اُنھیں دیکھ لیا تو پھر ایک دم

خوش ہو گئے۔

کیانی صاحب ہر لحاظ سے ایک بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے دورانِ ملازمت میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ لیکن جہاں بھی رہے دیانت داری کی مثال قائم کی۔ سیشن ججی، ہائی کورٹ کی ججی اور پھر چیف جسٹس کے عہدوں پر وہ ایک بڑا عرصہ رہے، لیکن انہوں نے کسی ڈر یا لالچ سے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ دیکھنے میں وہ ایک دُبلے پتلے انسان تھے لیکن ان کی جرأت اور دلیری بھی مثالی تھی۔ انہوں نے ملازمت کے دوران بھی ملک میں بدعنوانیوں، رشوتوں اور مختلف محکموں کی نااہلی کے خلاف کھل کر بات کی۔ ان کی تقریروں میں بڑی جان تھی۔ وہ ہنسی مذاق میں حاکموں کو ایسی ایسی کھری باتیں سُنا جاتے تھے جنھیں سُن کر وہ تلملا اُٹھتے۔ محمد رُستم کیانی کی تقریروں کے ایک ایک لفظ سے ان کی حبّ الوطنی، جرأت مندی، غریبوں سے محبّت، ظلم سے نفرت اور انصاف سے محبت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی تقریروں کا ایک مخصوص انداز ہے اور پڑھے لکھے حلقوں میں انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مشق

۱۔ محمد رستم کیانی کے بڑے بھائی کا نام بتائیے۔
۲۔ کیانی خاندان کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟
۳۔ جسٹس ایم۔ آر کیانی کن کن عہدوں پر فائز رہے؟
۴۔ ان کی تقریروں میں کیا خاص چیزیں ہیں؟
۵۔ محمد رُستم کیانی نے قائدِ اعظمؒ سے اپنی ملاقات کا جو ذکر کیا ہے وہ بیان کیجیے۔
۶۔ اس سبق میں کچھ الفاظ آئے ہیں۔ چاپلوسی۔ خوشامد۔ مقبول و پسندیدہ۔ غور کیجیے۔ چاپلوسی کے جو معنی ہیں وہی معنی خوشامد کے ہیں۔ اور جو معنی مقبول کے ہیں، وہی پسندیدہ کے ہیں۔ ایسے الفاظ جو باہم ہم معنی ہیں ان کو مترادف الفاظ کہا جاتا ہے جیسے استقلال و ثابت قدمی۔ جرأت و دلیری۔ فریاد و فغاں۔ شور و غُل وغیرہ۔ آپ اِس قسم کے مترادف الفاظ اپنے پڑھے ہوئے سبقوں میں تلاش کر کے لکھیے۔

چیچک کا ٹیکہ

اکبر، اصغر اور رقیہ تین بہن بھائی ہیں۔ چھٹی کے دن تینوں گھر کے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ آج بھی اکبر اور رقیہ بیٹھے اصغر کا انتظار کر رہے تھے۔ اصغر فٹ بال کا میچ دیکھنے گیا ہوا تھا۔ اتنے میں وہ آتا دکھائی دیا تو اکبر نے رقیہ سے کہا۔

اکبر :- وہ دیکھو اصغر آ رہا ہے۔ آج تو جناب کی شان دیکھنے کے لائق ہے۔ اتنے عمدہ عمدہ کپڑے اور اتنے سلیقے سے پہنے ہوئے ہے کہ بس دیکھتے ہی جاؤ۔

رقیہ :- جب سے اُس کے ماسٹر صاحب نے اُسے صاف ستھرا رہنے کی تلقین کی ہے، تب سے اچھے اچھے اور صاف کپڑے پہننے لگا ہے۔

اکبر :- بڑی اچھی بات ہے، ہمیں ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہننا چاہیے۔ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔ آؤ بھئی اصغر بڑی دیر کر دی۔ کہاں رہے ؟

اصغر :- میچ دیکھنے کے بعد داؤد کے گھر چلا گیا تھا، اُس کے چھوٹے بھائی کے چیچک نکل آئی ہے۔

اکبر :- اوہو! یہ تو بہت بُری خبر سنائی تم نے۔ چیچک تو بڑا نامراد مرض ہے۔

رقیہ :- کیا چیچک کا کوئی علاج نہیں ؟

اکبر :- لاعلاج تو کوئی مرض بھی نہیں۔

اصغر :- پھر اس سے اتنے خوف زدہ کیوں ہو، تمہارا تو رنگ اُڑا جا رہا ہے۔

اکبر :- بھئی مذاق مت کرو۔ ایسی موذی بیماریوں سے ڈرنا ہی چاہیے۔

رقیہ :- آخر ڈرنے کی وجہ بھی تو معلوم ہو ؟

اکبر :- گو یہ مرض مہلک نہیں لیکن اکثر مہلک بیماریوں سے بدتر ہے۔

اصغر :- وہ کیسے۔

اکبر :- اکثر دیکھا ہے کہ چیچک کے حملے سے مریض کی یا تو آنکھیں جاتی رہتی ہیں یا اُس کے جسم پر ایسے بدنما داغ پڑ جاتے ہیں جن سے عمر بھر چھٹکارا نہیں ملتا۔

اصغر :- ارے ہاں اُس دن میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ اُس کا سارا چہرہ داغ دار تھا۔

اکبر :- وہ بھی چیچک کا مریض رہا ہوگا۔

رقیہ :- مگر اس کا علاج بھی تو ہوگا ؟

اکبر :۔ہاں ہے، مرض کے حملے کے بعد تو علاج بہت مشکل ہو جاتا ہے لیکن اس سے پہلے بہت آسان ہے. یعنی اگر ٹیکہ لگوا لیا جائے تو چیچک کا خطرہ نہیں رہتا.

اصغر :۔ وہی ٹیکہ جو آج کل گاؤں گاؤں لگایا جا رہا ہے؟

اکبر :۔ ہاں وہی ٹیکہ!

رقیہ :۔ تو کیا ٹیکہ چیچک کو بالکل روک دیتا ہے؟

اکبر :۔ بالکل روک دیتا ہے۔

اصغر :۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔ مگر ٹیکے کا اصول کیا ہے؟

اکبر :۔ ٹیکے کا اصول یہی ہے کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔

اصغر :۔ یعنی کیا مطلب؟

اکبر :۔ بات یہ ہے کہ ٹیکے کے ذریعے جو دوا ہمارے جسم میں پہنچائی جاتی ہے اس میں چیچک کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ چیچک کی ابتداء گائے کے بچھڑوں سے ہوئی تھی اس لیے اس کا مواد بڑی احتیاط سے گایوں اور بچھڑوں سے حاصل کیا جاتا ہے. یہ مواد انسان کے جسم میں داخل کر دیا جاتا ہے. جس شخص نے ٹیکہ لگوا لیا ہو وہ چیچک سے محفوظ رہتا ہے۔

رقیہ :۔ وہ کیسے؟

اکبر :۔ بھئی جب وبا پھیلتی ہے تو اِس بیماری کے جراثیم اُس شخص پر حملہ کرتے ہیں۔ مگر چونکہ اُس کے جسم میں پہلے سے ٹیکے والے جراثیم موجود ہوتے ہیں اس لیے یہ جراثیم بیماری والے جراثیم کا مقابلہ کرتے ہیں اور اُنھیں اس شخص پر غلبہ حاصل کرنے سے روکتے ہیں۔ دونوں میں جنگ ہوتی ہے اور دونوں فنا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ آدمی بیماری سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

اصغر :۔ کیا چیچک کا مرض دوسرے لوگوں کو بھی ہو جاتا ہے؟

اکبر :۔ ہاں، یہ چھوت چھات والا مرض ہے۔ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کو نہایت تیزی سے ہو سکتا ہے۔

رقیہ :۔ تو پھر اس سے کیسے بچا جائے؟

اکبر :۔ ایک تو ٹیکہ لگوا لیا جائے، دوسرے اگر کہیں چیچک پھوٹ پڑے تو فوراً ہسپتال والوں کو اطلاع دینی چاہیے۔ مریض کو گھر کے دُوسرے افراد سے دُور رکھا جائے۔

اصغر :۔ کیا ایک دفعہ ٹیکہ لگوا لینے سے انسان عمر بھر بیماری سے محفوظ رہتا ہے؟

اکبر :۔ ایک دفعہ ٹیکہ لگوا لینا تمام عمر کے لیے کافی نہیں۔ اس مرض سے بچنے کے لیے وقتاً فوقتاً ٹیکہ لگواتے رہنا چاہیے۔

رقیہ :۔ ٹیکہ تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کیا ڈاکٹروں نے دوسرے امراض کے ٹیکے دریافت نہیں کیے؟
اکبر :۔ چیچک کے ٹیکے کی عالمگیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹروں نے بعض دوسرے امراض کے لیے ٹیکے ایجاد کرنے کے لیے زبردست تحقیقات کی ہیں اور انہیں کافی کامیابی بھی ہوئی ہے۔
اصغر :۔ کون کون سے امراض کے ٹیکے دریافت ہو چکے ہیں؟
اکبر :۔ تپ محرقہ، تپ دق، وبائی بخار، ہیضہ اور طاعون کا دفعیہ ٹیکوں کے ذریعے بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔
رقیہ :۔ ہماری استانی کہہ رہی تھیں کہ ہمیں ان بیماریوں کے خلاف قومی مہم میں حصّہ لینا چاہیے۔ مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟
اکبر :۔ تمھاری استانی صاحبہ نے بڑی اچھی بات کہی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم گھر گھر جا کر لوگوں کو ان بیماریوں کی روک تھام کے طریقے بتائیں اور انہیں ترغیب دیں کہ وہ اپنے گھروں کو صاف ستھرا، ہوادار اور کشادہ بنائیں۔ بعض لوگ ٹیکہ لگوانے سے ہچکچاتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ انہیں ٹیکے کے فوائد سمجھائیں۔
اصغر :۔ ملیریا کا موسم بھی تو آ رہا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟
اکبر :۔ ٹھیک کہا تم نے، ملیریا کا موسم آنے ہی والا ہے۔ اس سے بچاؤ کی تدبیر یہ ہے کہ ہمارے اِرد گرد جو چھوٹے چھوٹے گڑھے ہیں۔ انہیں مٹی سے پاٹ دیا جائے۔ کیونکہ ملیریا عام طور پر مچھر کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔ اور یہ مچھر ان گڑھوں میں کھڑے پانی میں نشوونما پاتا ہے۔ اور اس پانی پر مٹی کا تیل چھڑک دیا جائے تو مچھروں کی پیدائش ختم ہو جاتی ہے۔
رقیہ :۔ ملیریا والے گھروں میں کسی دوا کا چھڑکاؤ بھی تو کرتے ہیں۔
اکبر :۔ ہاں۔ گھروں میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی کا چھڑکاؤ بہت ضروری ہے اور ہمیں اس سلسلے میں ملیریا والوں سے تعاون کرنا چاہیے، کیونکہ اِس وقت ہماری قوم کو صحت مند افراد کی ضرورت ہے اور یہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم میں سے ہر شخص بیماریوں کا قلع قمع کرنے میں حکومت کا ساتھ دے۔
اصغر :۔ ٹھیک کہا تم نے، کل جب میں سکول جاؤں گا تو اپنے دوسرے دوستوں کو بھی اس مہم میں شریک ہونے کی دعوت دوں گا۔ کیوں کیا خیال ہے رقیہ؟
رقیہ :۔ بالکل بجا! میں بھی اپنی سہیلیوں کو اِس بارے میں قائل کروں گی۔

مشق

۱۔ اپنے استاد سے مختلف بیماریوں کی روک تھام کے طریقے سیکھیے۔
۲۔ دو دوستوں کے درمیان کسی موضوع پر بات چیت تحریر کیجیے۔ ۳۔ اس سبق کو اپنے الفاظ میں لکھیے۔
۴۔ چیچک کا مرض کیوں خوف ناک سمجھا جاتا ہے؟ ۵۔ چیچک سے بچنے کا کیا طریقہ ہے؟

کلیمؔ اور ظاہردار بیگ

[ایک بار دلّی میں ہیضے کی سخت وبا پھیلی۔ نصوحؔ پوری احتیاط کے باوجود اس مُوذی مرض میں مبتلا ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اسے خواب آور دوا پلائی اور وہ سوگیا۔ سوتے میں اس نے خواب دیکھا جس میں اسے قیامت اور جنّت و دوزخ کے مناظر دکھائی دیے۔ بیدار ہوکر اُس نے اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی اصلاح کا پختہ ارادہ کرلیا۔ خاندان کے باقی افراد کو تو وہ راہِ راست پر لانے میں کامیاب ہوگیا لیکن سب سے بڑا لڑکا کلیمؔ اپنی روش ترک کرنے پر آمادہ نہ ہُوا۔ باپ نے بار بار اسے پاس بلایا لیکن کلیمؔ ملنے سے پہلوتہی کرتا رہا۔ آخرکار اس اُمید میں کہ اس کا "گندم نما جو فروش" دوست مرزا ظاہر دار بیگ ضرور اسے سہارا دے گا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ یہیں سے کلیمؔ کی اصل داستان شروع ہوتی ہے۔]

کلیمؔ کو کئی بار باپ نے بلوایا، یہاں تک کہ ہار کر رقعہ لکھا۔ ماں نے بہتیرا سمجھایا، بھائی نے بہت کچھ کہا سُنا، لیکن وہ روبراہ نہ ہُوا اور ایک رات آنکھ بچا، بے پوچھے گھر سے نِکل کھڑا ہُوا۔ جب سب گھر والے کھا پی کر فارغ ہوگئے اور اس کی ماں فہمیدہ سونے کے ارادے سے مکان میں آئی تو دیکھا کہ باہر کا دروازہ چوپٹ کھُلا ہے۔ کلیمؔ کو اِدھر دیکھا، اُدھر دیکھا، کہیں پتہ نہیں۔ سمجھی کہ موقع پاکر چل دیا۔ رات ہوگئی تھی، زیادہ بات کا چرچا کرنا مناسب نہ جان کر سب لوگ سو سُلا رہے۔ نصوحؔ کو کلیمؔ کی نافرمانیوں پر غصّہ تو رات ہی بہتیرا کچھ آیا اور بار بار اس کے دِل نے چاہا کہ اس وقت اِدھر یا اُدھر جو کچھ ہو فیصلہ کردے۔ لیکن چند در چند باتوں کے لحاظ سے وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر چُپ ہو رہا اور مشکل سے اپنی طبیعت کو اس بات پر رضامند کیا کہ پیامِ زبانی کا اثر اور تحریر کا نتیجہ تو معلوم ہُوا۔ ایک مرتبہ رُو در رُو کہہ کر بھی دیکھ لو۔ اس پر بھی نہ سمجھے تو اپنا سر کھائے۔ اس ارادے سے وہ پہلے مردانے مکان میں آکر ٹھہرا۔ جب کلیمؔ اس کو نظر نہ آیا۔ اس نے نوکروں سے پوچھا تو کسی نے صاف جواب نہ دیا۔ بیگم نے اسے بتایا کہ کوئی ڈیڑھ پہر رات گئے جب وہ سونے کو آئی تو دیکھا کہ مکان خالی پڑا ہے۔

کلیمؔ کا گھر سے نکلنا کچھ نیا نہ تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر ناراض ہوکر پہلے بھی وہ اکثر گھر سے نکل جایا کرتا تھا لیکن ہر بار نوکر اُسے منا لاتے۔ اس مرتبہ بھی وہ یہ توقع دل میں لے کر نکلا کہ گلی سے نکلتے نکلتے نوکر اس کے پیچھے دوڑیں گے اور اسی امید میں اس نے اپنے دوست ظاہر دار بیگ کے

گھر پہنچتے پہنچتے کوئی سینکڑوں ہی مرتبہ پیچھے پھر پھر کر دیکھا مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ اب کلیم کے سوا گھر کا باوا آدم ہی بدلا ہوا تھا۔ نہ اگلا سا باپ، نہ پہلی سی ماں، نوکر ڈھونڈیں تو کہاں دوڑیں تو کس لیے؟ پھر بھی کلیم اس سے بے خبر نہ تھا کہ اس مرتبہ ایک خاص طرح کا بگاڑ ہے پہلے جب کلیم گھر سے ناخوش ہو کر نکلا تو کھانے، پہننے یا کپڑے پیسے کے لین دین پر، یا ماں یا بھائی بہنوں سے لڑائی جھگڑے کے سبب۔ لیکن اس دفعہ دین کی بحث تھی لین دین کا قصہ نہ تھا۔ باپ سے لڑائی تھی نہ بھائی بہنوں سے۔ ذرا سی عقل بھی کلیم کو ہوتی تو وہ ایسی حالت میں گھر سے نکلنے کی دلیری نہ کرتا لیکن جیسا کہ نصوح نے تجویز کیا تھا، اس پر شاعری کی پھٹکار تھی اور سر پر شامتِ اعمال سوار۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جب انسان رات دن داد حاصل کرنے کی فکر میں رہے تو ضرور ہے کہ اس میں خود پسندی اور خود بینی کے عیوب پیدا ہوں گے۔ یہ ہے بھی صحیح کہ شاعری میں اس وقت سارے شہر میں کلیم کا طوطی بولتا تھا۔ وہ قریب قریب جملہ اصنافِ سخن میں مہارت رکھتا تھا اور بڑے بڑے اساتذہ اس کے کلام پر عش عش کر اٹھتے تھے۔ مشق کا یہ عالم کہ چھ سات برس کی مدت میں اس نے دو دیوان مرتب کر لیے تھے۔ قبول عام کی یہ کیفیت کہ اس کے سینکڑوں اشعار لوگوں کو ازبر تھے۔ الغرض شاعری میں کلیم کی لن ترانیاں چنداں بے جا نہ تھیں۔ لیکن دنیا کے معاملات میں ازبسکہ اس کو خوض کرنے کی عادت نہ تھی، اسی وجہ سے اکثر اس کی رائے غلطی پر ہوتی۔ وہ گھر سے نکل کر ایسا بے تکلف مرزا ظاہر دار بیگ کی طرف مڑا جیسے مطلق العنان گھوڑا تھان کی طرف رُخ کرتا ہے۔ مرزا کی ظاہر داری نے اس کو اس قدر دھوکا دے رکھا تھا کہ وہ ان کو ماں، باپ، بہن، بھائی، خویش و اقارب سب سے بڑھ کر اپنا خیر خواہ، سب سے زیادہ اپنا دوست سمجھتا تھا۔ اور بے امتحان، بے آزمائش اس کو مرزا پر ایسا تکیہ و اعتماد تھا کہ اتنا شاید دانش مند آدمی کو متواتر تجربوں کے بعد کسی دوست پر نہیں ہو سکتا۔ بات اصل یہ ہے کہ مردم شناسی کی جو ایک صفت ہے، کلیم میں مطلق نہ تھی۔ مرزا سے زیادہ اس کو اپنی نسبت مغالطہ تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خناس سمایا ہوا تھا کہ گویا تمام ہندوستان کی سرکاریں اس انتظار میں ہیں کہ کلیم ذرا ان کی طرف متوجہ ہو اور وہ شکریے کے ساتھ اسے کسی منصب کی پیش کش کر دیں۔ وہ اس خیال میں تھا کہ جدھر چل کھڑا ہوگا، وہاں کا والیٔ ملک اس کی تشریف آوری کو بس غنیمت سمجھے گا۔ قصہ کوتاہ۔ کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی، لیکن مرزا جیسے نکمّے بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا زنا وہ بھی حقیقی نہیں، انگریزی حکومت کی ابتداء میں ریذیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ چونکہ ان دنوں رشوت ستانی اور بد عنوانی عام تھی اس لیے اس نے خوب کمایا، یہاں تک کہ اس کا شمار دِلی کے معزز لوگوں میں ہونے لگا۔ مرزا کی ماں جوانی میں بیوہ ہوگئی، جمعدار نے باوجودیکہ اس سے کوئی ایسا قریب کا رشتہ بھی نہ تھا بعض اللہ کی رضا کے لیے اس کی پرورش اپنے ذمّے لے لی۔ اپنے جیتے جی جمعدار اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھُول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے، پوتے، نواسے کثرت سے تھے۔ انھوں نے جمعدار کی وصیّت کی پروا نہ کرتے ہوئے ظاہردار بیگ اور اس کی ماں سے آنکھیں پھیر لیں اور بڑی مشکل سے محل سرا کے پہلو میں ایک چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینے کی دکانیں مرزا کے نام کروا دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی، تین آدمی اور آمدنی کُل سات روپے۔ اس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے جن کو صد ہا روپے ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے لیے اور بھی بُرا تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں، مگر امیرزادگی نہ تھی تو کیسے نبھے۔ دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہتیرا کہتی مگر کون سنتا تھا، مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی، سر پر دوہری بیل کی کامدار ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے، اوپر شبنم کی تن زیب۔ نیچے کوئی طرح دار سا ڈھاکے کا نینو جاڑا ہو تو بانات مگر سات روپے گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح شام کا لباس ہوا اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کم خواب کی عمدہ بیل ٹنکی ہوئی، سُرخ نیفہ۔ پائے جامہ، اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا۔ اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب چھیلا بنے ہوئے سرِ بازار چھم چھم کرتے چلے آرہے ہیں۔
کلیم سے اور مرزا سے محفلِ مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی، لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا اصلی حال کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا، کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو مِلا اور وہ جمعدار کی

ڈل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے، پوتی کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا۔ اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں۔ کلیم نے ان سے مرزا کے بھیجنے کو کہا۔ مگر انھوں نے اس پر لاعلمی کا اظہار کیا۔ کلیم نے جب ظاہر دار بیگ کا نام لیا تو ایک لونڈی نے اس سے تدرے سوچ بچار کے بعد پوچھا کہ یہ وہی مرزا تو نہیں جن کی رنگت زرد زرد ہے، آنکھیں کرنجی، چھوٹا قد، دبلا ڈیل، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔ اس پر کلیم نے اُسے بتایا کہ وہی مرزا ظاہر دار بیگ ہیں۔ لونڈی نے مرزا کے مکان کا نشان بتاتے ہوئے کلیم سے کہا کہ اس مکان کے پچھواڑے میں اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے وہ اس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جاکر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگھیہ پہنے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے کہ آہا! آپ ہیں، معاف کیجیے گا، میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں۔ کلیم نے جب رات اسی کے ہاں بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مرزا نے اسے ایک مسجد دکھا دی۔ کلیم نے وہاں جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ نہایت پُرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ وہ بھی مسجدِ ضرار کی طرح ویران، وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے، نہ کوئی مُلّا، نہ کوئی طالب علم، نہ کوئی مسافر، ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی بے وقت کی تسبیح سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ کلیم، مرزا کی یہ حالت دیکھ کر سخت حیران تھا۔ لیکن گھر سے نکل آیا تھا اس لیے خود بخود گھر لوٹ جانے میں کسرِ شان سمجھتا تھا۔ آخر وہ مرزا سے پوچھ ہی بیٹھا کہ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کڑے اور گنج اور دکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں تو جانتا ہوں کہ عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی مِلک نہ بتایا ہو یا یہ حال ہے کہ ایک آدمی کے واسطے ایک شب کے لیے تم کو جگہ میسّر نہیں۔ مرزا یہاں بھی پرانی ظاہر داری کو کام میں لائے اور بولے "آپ کو میری نسبت محض باتیں بنانے کا شبہ ہوا ہے۔ مگر افسوس کہ اتنی مدّت کی صحبت کے بعد بھی آپ مجھے پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہوگیا

لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے، اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منائے جائیں"۔ چار و ناچار کلیم کو اس کی باتوں پر اعتبار کرنا پڑا۔

مسجد میں چونکہ سخت اندھیرا تھا، کلیم نے مرزا سے چراغ بھیجنے کو کہا، لیکن مرزا اس کا کیا بندوبست کرتے البتہ کلیم کو یہ جواب سننا پڑا "چراغ کیا، میں نے تو لیمپ روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن گرمی کے دن ہیں، پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جائیے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے، روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہ تاب نکل آتا ہے"۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا، لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی۔ اب جو بھوک لگی تو سوچنے لگا کہ شاید مرزا خود ہی کھانے کو پوچھیں۔ جب اُس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سنو یار، میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ مرزا سے اس کی تدبیر اور کیا ہوتی، چھدامی بھڑبھونجے کے ہاں سے ایک دھیلے کی چنے کی دال بھنوا لایا اور کلیم کے ساتھ خود بھی اس میں شریک ہو کر چنوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔

کلیم نرم نرم بچھونوں پر سونے کا عادی تھا لیکن بہت کچھ کہنے سننے کے بعد مرزا کے ہاں سے اسے رات بسر کرنے کو ایک میلی سی دری اور پرانا سا تکیہ ہی میسّر آ سکا۔ گھر کے آرام کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ دوست نہ غم خوار، نہ نوکر نہ خدمت گار، مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہ گار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہہ پکڑتا۔ اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے بجر دم باپ کے ساتھ نمازِ صبح میں جا شریک ہوتا۔ مگر اس کی قسمت میں ابھی اور بھی بہت سے مصائب لکھے ہوئے تھے۔ آخر دم تک اس نے باپ کی نصیحتوں پر عمل نہ کیا اور جگہ جگہ ذلت اور رسوائی اُٹھاتا پھرا۔ (تلخیص توبۃ النّصوح)

مشق

۱۔ کلیم اور ظاہردار بیگ کے کردار مولانا نذیر احمد کی مشہور کتاب "توبۃ النّصوح" کا ایک حصّہ ہیں۔ یہ کتاب قصّے کے اعتبار سے بھی دلچسپ ہے اور اس کے مضامین بھی سبق آموز ہیں۔ آپ بھی یہ کتاب کہیں سے حاصل کر کے پڑھنے کی کوشش کیجیے۔ ممکن ہے اس کے بعض حصّے آپ کو مشکل معلوم ہوں لیکن

بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی — پر بُوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرے کے دل پہ تھا یہ خطرہ — ناچیز ہُوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا — میں اور کی گوں نہ آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس — اپنا ہی کروں گا ستیا ناس
آتی ہے مجھے برسنے سے شرم — مٹی پتھّر تمام ہیں گرم
کس برتے پہ میں کروں دلیری — میں کون ہُوں کیا بساط میری
ہر قطرے کے دل میں تھا یہی غم — سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کِھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی — کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی
اِک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور — ہمّت کے محیط کا شناور
بولا للکار کر کہ آؤ — میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہو سکے اِحسان — ڈالو مُردہ زمین میں جان
یارو یہ ہِچر مِچر کہاں تک — اپنی سی کرو بنے جہاں تک
کہتا ہُوں یہ سب سے برملا میں — آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ — دشوار ہے جی پہ کھیل جانا
دیکھی جرأت جو اس سخی کی — دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا — قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار — بارش لگی ہونے موسلا دھار
پانی پانی ہُوا بیاباں — سیراب ہوئے چمن، خیاباں

تھی قحط سے پائمال خلقت
اس مینہ سے ہُوئی نہال خلقت

(مولانا اسماعیل میرٹھی)

حضرت شیخ الاسلام بہاؤالدّین زکریا ملتانیؒ

خاندانِ غلاماں کا نامور سلطان شمسُ الدّین التمش دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس درویش صفت بادشاہ کی دین داری، انصاف اور شرافت کے چرچے ہر سمت پھیل گئے۔ ملتان کی حکومت پر سلطان محمّد غوری کا ایک اور سالار ناصرالدین قباچہ حاکم تھا۔ وہ التمش کی شہرت سے جل بُھن اُٹھا اور التمش کے خلاف گھناؤنی سازشوں کا جال تیار کرنے لگا۔ ملتان میں اللہ کے دو نیک بندوں کو جب اِس کا علم ہُوا تو اُنھوں نے نیک نفس سلطان التمش کو اِن سازشوں کے بارے میں علیٰحدہ علیٰحدہ خطوط لکھے۔ ایک قاصد کے ذریعے اپنے خطوط دہلی بھیجنے کا بندوبست کیا، مگر مخبری ہوگئی اور قاصد کو ملتان سے نِکلتے ہُوئے گرفتار کر کے قباچہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ قباچہ ان خطوط کو پڑھ کر غصّے سے پیچ و تاب کھانے لگا اور فوراً اللہ کے ان دو نیک بندوں کو دربار میں بلا بھیجا۔

جب یہ دونوں دربار میں پہنچے تو ان میں سے ایک کی عوام میں بے حد مقبولیّت کی وجہ سے قباچہ اُنھیں تعظیم دینے کے لیے مجبوراً اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ان میں سے ایک کو اپنے پاس مسند پر جگہ دی اور دوسرے کو اپنے سامنے بٹھایا۔ پھر ایک خط نکالا اور اپنے سامنے بیٹھنے والے بزرگ سے مخاطب ہوکر کہا، "قاضی صاحب! یہ خط آپ کا ہے"۔ قاضی صاحب اپنے خط کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور سمجھ گئے کہ ان کا خط جو التمش کو بھیجا گیا تھا، پکڑا گیا ہے۔ اُنھوں نے نادم ہوکر گردن نیچی کر لی۔ اِس کے بعد قباچہ نے ایک اور خط نکال کر ساتھ والے بزرگ کی طرف بڑھایا اور کہا، "حضرت! یہ خط آپ ہی نے التمش کو لکھا ہے"۔ بزرگ نہایت جراُت دلیری اور استقلال سے فرماتے ہیں۔ "اے قباچہ! ہاں یہ خط میرا ہے اور میں نے التمش کو لکھا ہے اور میں نے یہ خط حکمِ الٰہی سے لکھا ہے"۔ یہ سُن کر قباچہ لرزہ براندام ہو گیا، اپنی گستاخی کی معافی مانگی اور آپ کو نہایت عزّت و احترام کے ساتھ دربار سے رخصت کر دیا، لیکن قاضی صاحب کو روک لیا اور پھر اُنھیں شہید کر دیا۔

جانتے ہو یہ قاضی صاحب اور دُوسرے بزرگ کون تھے، قاضی شرف الدّین اصفہانی ملتان شہر کے قاضی تھے۔ آپ بہت بڑے عالم دین تھے اور دُوسرے بزرگ جن کی تیوری پر بل دیکھ کر قباچہ گھبرا گیا تھا جنھوں نے نہایت دلیری سے قباچہ کے سامنے التمش کو خط

لکھنے کا اقرار کرلیا تھا، حضرت شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریاؒ سہروردی ملتانی تھے جو بلند پایہ عالمِ دین ہونے کے علاوہ بہت بڑے ولی اللہ ہو گزرے ہیں۔

آپ قریش کے معزز قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے جدِّ امجد کمال الدین قریشی مکّہ معظمہ سے نقلِ مکانی کرکے پہلے خوارزم کی سلطنت میں آباد ہوئے اور پھر وہاں سے ملتان آکر بس گئے۔ ان کے بیٹے مولانا وجیہہ الدّین کی شادی حسام الدّین ترمذی کی دختر سے ہوئی۔ یہی ترمذی آپ کے نانا تھے چنانچہ آپ کے نانا آپ کی والدہ کے ساتھ قلعہ کوٹ کروڑ چلے گئے جو ملتان کے نزدیک محفوظ مقام تھا۔ ملتان اور اس کے ارد گرد ان دنوں تاتاریوں کی یورش کی وجہ سے امن وسلامتی ختم ہوچکی تھی۔ یہاں رمضان المبارک کے مہینے میں حضرت بہاؤ الدّین زکریا کی پیدائش ہوئی۔ ابھی بارہ سال ہی کے ہوئے تھے کہ آپ کے والد محترم وفات پا گئے۔ اس وقت تک وہ ابتدائی دینی کتابیں پڑھ چکے تھے۔ پھر آپ نے قرآنِ شریف حفظ کرنا شروع کیا تو ساتوں قرأتوں کے ساتھ تھوڑی مدت میں مکمّل حفظ کر لیا۔

مزید دینی تعلیم کے حصول کے لیے آپ نے خراسان کی طرف سفر کیا، وہاں سے بخارا پہنچے۔ بخارا ان دنوں اسلامی علوم کا گہوارہ اور مرکز تھا۔ یہاں آپ نے پورے آٹھ سال قیام کیا اور قرآنی علوم کے علاوہ حدیث، فقہ اور تفسیر کی تعلیم کو مکمل کیا۔ پھر حج اور دیارِ نبی کی زیارت کا شوق دامن گیر ہُوا۔ حج ادا کیا اور روضۂ اقدس پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ اِس مقدّس سر زمین پر آپ تقریبًا پانچ سال رہے۔ یہ مدّت آپ نے ریاضت اور عبادت میں گذاری یہاں تک کہ تاجدارِ مدینہؐ کے فیوض اور برکات سے آپ مالامال ہوگئے۔ حجاز سے آپ بیت المقدس پہنچے اور انبیائے کرام کے مزاروں پر حاضری دی۔ وہاں سے آپ بغداد پہنچے۔ بغداد اس وقت دنیا کا سب سے مشہُور اور بڑا شہر تھا اور علوم وفنون کا مرکز، شہر میں بڑی بڑی درس گاہیں تھیں جن میں دُور دُور سے طلباء آکر علم کی پیاس بجھاتے۔ اُونچے درجے کے علماء کے علاوہ یہ شہر بڑے بڑے صوفیائے کرام کا مسکن بھی تھا۔

اِن بزرگانِ دین کے آستانوں پر شاہ وگدا، امیر وغریب، ادنیٰ واعلیٰ حاضری دیتے اور راہِ ہدایت پاتے۔ جن دنوں کا ہم ذکر کررہے ہیں، بغداد میں اس وقت حضرت شہابُ الدّینؒ سہر وردی کے علم و عرفان کی بڑی شہرت تھی۔ حضرت بہاؤ الدّین زکریاؒ اُن کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ حضرت شہاب الدّینؒ سہر وردی نے انھیں اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرلیا اور بہت مختصر عرصہ میں انھوں نے حضرت شہابُ الدّین سُہر وردی علیہ الرحمتہ سے خرقۂ خلافت پایا۔

آپ کے مرشد حضرت شہاب الدّینؒ سہر وردی نے آپ کو رخصت فرمایا اور ہدایت کی کہ ملتان پہنچ کر

خلقِ خدا کو ہدایت اور سیدھے راستے کی طرف بلائیں۔ حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق ملتان پہنچے تو ملتان کے لوگ آپ کی آمد سے دل میں کڑھنے لگے اور پھر آپ کی خدمت میں پانی سے لبریز ایک پیالہ بھیجا جس کا مطلب یہ تھا کہ ملتان پہلے ہی پیروں، بزرگوں اور صوفیوں سے اَٹا پڑا ہے۔ یہاں اب کسی کی گنجائش نہیں۔ حضرت زکریا ملتانیؒ نے اُن کے اِس کنایہ اور اِشارہ کو بھانپ لیا۔ آپ نے پانی کا پیالہ ہاتھ میں لے کر پانی کی سطح پر ایک گلاب کا پھول چھوڑ دیا جو پانی میں تیرنے لگا۔ گویا پانی کے بھیجنے والوں کو آپ نے جواب دیا کہ صوفیوں اور عالموں سے بھرے ہوئے اِس شہر میں ہم اس طرح رہیں گے جس طرح پانی سے لبریز پیالے کی سطح پر پھول تیر رہا ہوتا ہے۔ یعنی ہم کسی کے بارِ خاطر نہ ہوں گے بلکہ ہماری موجودگی پھول کی طرح اپنی لطافت کے ساتھ فضا میں خوشبوئیں بکھیرتی رہے گی۔

ملتان سے قریب پاک پٹن میں اس وقت چشتیہ سلسلے کی ایک اور عظیم ہستی لوگوں کو ہدایت اور صراطِ مستقیم کی طرف بلا رہی تھی۔ یہ نامور اور بلند پایہ ولی اللہ حضرت فرید الدین شکر گنج علیہ الرحمۃ تھے۔ حضرت بابا فرید الدینؒ اور حضرت زکریا ملتانیؒ کی آپس میں بڑی محبت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے مِل کر کشمیر سے لے کر سندھ تک بہت سے تبلیغی دورے کیے اور ان کے ہاتھوں پر بہت سے کافروں نے دینِ اسلام قبول کیا۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ برصغیر جس میں بھارت اور پاکستان شامل ہیں، اس میں بُت پرست ہندو رہتے تھے، ان ہندوؤں کو دینِ اسلام کی تبلیغ کرنے اور مسلمان بنانے میں صوفیا کے چاروں سلسلوں سُہروردیہ، چشتیہ، قادریہ اور نقشبندیہ کے بزرگوں نے بڑا کام کیا ہے۔ حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ کے دستِ حق پرست پر بھی بے شمار ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ آپ کی تمام عمر یادِ الٰہی میں گزری اور آپ اپنے پیر سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد زندگی کے آخری لمحوں تک لوگوں کو دینِ اِسلام، سچائی اور نیکی کی راہ پر چلنے کی تبلیغ کرتے رہے۔

آپ اپنے مریدوں سے فرماتے تھے کہ "اگر بدن کی سلامتی چاہتے ہو تو کم سے کم کھاؤ، رُوح کی سلامتی کی ضرورت ہے تو گناہوں کو چھوڑ دو، اور دین کی سلامتی کی ضرورت ہے تو سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ پر کثرت سے دُرود بھیجتے رہو"۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے اپنے مریدوں سے کہا کہ "تم میں سے کوئی ہے جو ایک رکعت میں تمام قرآن شریف ختم کر دے"۔ کسی مرید نے اثبات میں جواب نہ دیا۔ آپ کھڑے ہو گئے، فوراً نماز کی نیت باندھ لی اور ایک رکعت میں پورا قرآن شریف ختم کر ڈالا۔

آپ کے علم و فضل کا اندازہ اِس بات سے ہوتا ہے کہ آپ کو حکومت کی طرف سے

شیخ الاسلام کا عہدہ دیا گیا۔ شیخ الاسلام کا عہدہ قاضی القضاۃ سے بڑا ہوتا ہے اور مقدّمات کی آخری اپیل اس کے پاس ہوتی ہے۔ وہ اپنی دینی فراست کی بدولت مقدمات کے فیصلے کرتا ہے۔

آپ کی وفات کے متعلق بھی عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاؒء فرماتے ہیں کہ وفات کے دن آپ اپنے حجرے میں یادِ الٰہی میں مشغول تھے کہ حجرے کے باہر ایک نورانی چہرے والے بزرگ تشریف لائے۔ اُنھوں نے آپ کے صاحبزادے حضرت صدر الدّین عارف کو ایک خط دیا کہ اپنے والد کو پہنچا دیں۔ آپ کے صاحبزادے اسی وقت وہ خط لے کر باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خط پیش کیا۔ حضرت زکریا ملتانیؒ نے وہ خط لے لیا۔ آپ کے صاحبزادے جب باہر آئے تو خط لانے والا شخص غائب ہو چکا تھا۔ حضرت نے جب وہ خط پڑھا تو آپ کی روح نے اسی وقت آپ کے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ حجرے سے آواز بلند ہوئی۔ "وَصَلَ الحَبِیبُ اِلَی الحَبِیبِ" یعنی دوست دوست کے پاس پہنچ گیا۔ آپ کے صاحبزادے یہ آواز سُن کر حجرے کی طرف دوڑے، لیکن اب وہاں حضرت کا بے جان جسم موجود تھا اور آپ کی روح خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔

کہتے ہیں کہ حضرت بابا فرید الدّین گنج شکرؒ کو باطنی بصیرت سے آپ کے اِنتقال کی خبر ہوئی تو آپ غش کھا کر گر پڑے۔ بہت دیر تک بے ہوش رہے مرید جب آپ کو ہوش میں لائے اور عرض کی "سرکار کیا بات ہے؟" آپ نے فرمایا "آج میرے بھائی بہاؤ الدّین زکریاؒ اس دنیا میں نہیں رہے۔" پھر اُٹھے اور مریدوں کے ساتھ پاک پٹن ہی میں آپ کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی۔

مشق

۱۔ حضرت بہاؤ الدّین زکریا ملتانیؒ اور ملتان کے قاضی کو قباچہ نے دربار میں کیوں بلایا؟

۲۔ آپ نے قباچہ کو کیا جواب دیا؟ ۳۔ حضرت بہاؤ الدّین زکریاؒ کے علم و فضل کا اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے؟

۴۔ حضرت زکریا ملتانیؒ جب ملتان آئے تو لوگوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیسے کیا؟

۵۔ آپ کی وفات کا واقعہ بیان کیجیے۔ ۶۔ آپ کی وفات کی خبر سُن کر بابا فرید الدّین گنج شکرؒ پر کیا گذری؟

۷۔ اس سبق میں ایک مقام پر شاہ و گدا، امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں کا ہر لفظ اپنے ساتھ والے لفظ کی ضد ہے۔ مثلاً امیر آدمی اس کو کہا جاتا ہے جس کے پاس بہت زیادہ دولت ہو۔ اور غریب اُسے کہتے ہیں جس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ ہو۔ اسی طرح شاہ و گدا اور ادنیٰ و اعلیٰ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس قسم کے الفاظ جو ایک دوسرے کی ضد واقع ہوتے ہیں، انھیں متضاد الفاظ کہا جاتا ہے جیسے عالم کے مقابلے میں جاہل۔ روشنی کے مقابلے میں اندھیرا، دن کے مقابلے میں رات وغیرہ۔ ان کے بنانے کا کوئی خاص قاعدہ نہیں ہے۔ نیچے چند ایسے ہی الفاظ دیے گئے ہیں۔ آپ ان کے متضاد الفاظ کے بالمقابل لکھیے۔

نور مسرت انتہا بلند کامیابی کمزور

آدمی انجام خوب صورت

شمسی توانائی

سورج ہمارے لیے توانائی کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ ہے۔ کائنات میں ہر ذی رُوح اسی کی روشنی اور حرارت کے سہارے زندہ ہے۔ اگر سورج نہ ہوتا تو زمین اور اس پر زندگی کی یہ رونقیں جو آج ہم دیکھتے ہیں بالکل نہ ہوتیں۔ سُورج میں ہائیڈروجن گیس کثیر مقدار میں موجود ہے۔ سورج کے ایٹم مسلسل ٹوٹ رہے ہیں اور ہیلیم گیس میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس تبدیلی سے زبردست حرارت پیدا ہوتی ہے جو دُھوپ کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہے۔

دُھوپ کا فائدہ صرف یہاں تک ہی محدود نہیں ہے کہ ہمارے جسم کو گرم رکھتی ہے اور دیگر جانداروں کی صحت اور پرورش پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ موجودہ دنیا میں قوت اور حرارت کی بڑھتی ہوئی ضرُورت کے پیش نظر کچھ عرصہ سے سائنس دان اس کوشش میں مصروف ہیں کہ سُورج کی روشنی اور دُھوپ کو بھی اِنسانی ضروریات کے لیے مفید طور پر استعمال میں لایا جا سکے اور اس سے مشینوں کو چلانے کا کام اس طرح لیا جا سکے جیسے گیس، پٹرول، کوئلہ اور دیگر چیزوں سے لیا جاتا ہے۔ برسوں کی محنت کے بعد سائنس دان دُھوپ کو مفید مقاصد کے لیے استعمال میں لانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں اور مزید تجربات جاری ہیں۔

سائنس دانوں نے سورج کی حرارت کو پانی پر مرکوز کر کے پانی سے بھاپ پیدا کرنے اور پھر بھاپ سے بجلی پیدا کرنے کے کامیاب تجربات کر کے ایسے انجن تیار کیے ہیں جن کو شمسی انجن کا نام دیا گیا ہے۔ اس قسم کا سب سے پہلا کامیاب انجن ۱۹۰۴ء میں تیار کیا گیا جس کو امریکہ کے ایک صحرا میں سُورج کی تمازت جمع کر کے استعمال کیا گیا۔ اسی طرح ایک اور ماہر انجنیئر نے ایسا شمسی انجن تیار کیا جس کی مدد سے مصر میں تقریباً بارہ سو مربع میٹر کے رقبہ میں سُورج کی کرنوں کو مجتمع کر کے پچپن ہارس پاور قوت فراہم کی گئی۔

موجودہ ترقی یافتہ دور میں قوت کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جہاں اور مختلف تدابیر سوچی گئیں وہاں سائنس دانوں کی اَن تھک محنت کے بعد ایسی دُھوپ فیکٹریاں ایجاد کی گئی ہیں جن میں دُھوپ کی مدد سے بھاپ پیدا کی جا سکتی ہے۔ ایسی ہی ایک فیکٹری اسرائیل میں تیار ہو چکی ہے۔ افریقہ، یورپ اور امریکہ میں ایسی ٹنکیاں استعمال ہوتی ہیں جو دُھوپ کی مدد سے بہت جلد پانی گرم کر دیتی ہیں۔ اسی طرح فرانس اور کئی دیگر ممالک میں دھاتوں پر تحقیقات

کرنے کے لیے دُھوپ بھٹیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ ان دھوپ بھٹیوں میں شیشے کے موٹے عدسے استعمال ہوتے ہیں جو سورج کی کرنوں کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں اور اس طرح سے حاصل کی گئی حرارت کو مشینی قوّت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں ایک ایسا سیل بھی ایجاد کر لیا گیا ہے جو دُھوپ کی مدد سے برقی قوّت پیدا کرتا ہے۔ اس سیل کی مدد سے ایسے ریڈیو چلائے جا سکتے ہیں جن میں معمولی ٹیوب کے بجائے ٹرانزسٹر لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بحری جہازوں میں بعض آلوں کو روشن رکھنے کے لیے بھی یہ سیل استعمال ہوتے ہیں جو ایک قسم کی دُھوپ بیٹری کا کام دیتے ہیں۔ یہ سیل دھوپ کو براہِ راست بجلی میں تبدیل کرتے ہیں اور دن کے علاوہ رات کو بھی کام کرتے ہیں اور برسوں چلتے ہیں۔

روس میں تقریباً سارا سال دھوپ پڑتی ہے اس لیے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے اسے برقی قوّت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایسی سادہ دُھوپ مشینیں ایجاد کی گئی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی بخوبی استعمال کر سکتا ہے۔ کارخانوں اور گھروں کے علاوہ زراعت میں بھی دُھوپ مشینیں استعمال ہونے لگی ہیں، اور کوششیں جاری ہیں کہ خشک علاقوں میں پانی کی فراہمی بھی دھوپ سے ہی کی جائے۔ روسی سائنس دانوں نے حال ہی میں ایسے ریفریجریٹر ایجاد کیے ہیں جو بجلی کے بجائے دُھوپ سے چلتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک، ایک دن میں ساڑھے تین سو کلوگرام برف تیار کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ لاتعداد ایسے چولہے بھی استعمال میں ہیں جن پر دھوپ کی مدد سے کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک اوسط درجہ کا دھوپ چولہا اتنی ہی حرارت پیدا کرتا ہے جتنی چھ سو واٹ کے بجلی کے ہیٹر سے حاصل ہوتی ہے۔ بعض ایسے دُھوپ چولہے ہیں جو سیر و سفر کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ موڑ توڑ کر مختصر کیے جا سکتے ہیں۔ ان دُھوپ چولہوں میں تیل اور بتی کی ضرورت نہیں ہوتی حال ہی میں ہمارے ہمسایہ ملک بھارت کے سائنس دانوں نے بھی کامیاب تجربات کے بعد شمسی چولہے تیار کر لیے ہیں جو بہت مقبول ہوئے ہیں۔

امریکی سائنس دان ایسے مکان بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن میں بود و باش کا تمام دار و مدار دھوپ پر ہوگا۔ ان میں ایسی مشینیں لگی ہوں گی جو شمسی توانائی کی مدد سے گرمیوں میں مکان کو ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم رکھیں گی۔ کئی گھروں میں روشنی اور دھوپ پہنچانے کے لیے محدب شیشوں کو ایک موٹر کی مدد سے اس طرح حرکت دی جاتی ہے کہ ان کا رُخ ہمیشہ سُورج کی طرف رہتا ہے اور غروبِ آفتاب کے وقت تک اس کی کرنیں عمارت کے اندر داخل ہوتی رہتی ہیں جن سے کمرے گرم رہتے ہیں۔

سائنس دانوں کے خیال کے مطابق دُھوپ معمولی چولہے سے لے کر خلائی راکٹ تک چلانے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس وقت زمین کے گرد جتنے بھی مصنوعی سیارے گردش کرتے ہیں۔ ان میں ایسی ہی بیٹریاں نصب ہیں جو خود بخود دھوپ کی مدد سے چلتی رہتی ہیں۔ چونکہ پاک و ہند میں مغربی ممالک کے برعکس سارا سال کھلی دھوپ پڑتی ہے اس لیے شمسی توانائی حاصل کرنے کے لیے سائنس دانوں نے منصوبے بنا رکھے ہیں اور محدود پیمانے پر اس توانائی سے کچھ کام بھی لیا جا رہا ہے۔ تاہم پاکستان میں شمسی توانائی کو صنعتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا باقی ہے۔ اُمید کی جا سکتی ہے کہ اگر ہمارے سائنس دانوں نے دن رات محنت کی تو وہ وقت دُور نہیں جب ہمارے ملک میں بھی شمسی انجن اور شمسی مشینیں دستیاب ہو سکیں گی جن کی مدد سے اس ترقی یافتہ دور میں برقی قوت کی بڑھتی ہوئی ضروریات شمسی توانائی سے پوری ہوں گی۔ دُھوپ کی مدد سے بنجر اور خشک زمینیں قابلِ کاشت بن سکیں گی، دیگر ضروریاتِ زندگی بھی شمسی توانائی کی مدد سے پوری ہوں گی۔

مشق

۱ - سُورج کی حرارت سے دُھوپ کس طرح پیدا ہوتی ہے؟
۲ - دُھوپ کے فوائد تحریر کیجیے۔
۳ - شمسی انجن سے کیا مراد ہے اور یہ کس طرح کام کرتے ہیں؟
۴ - بعض مغربی ممالک میں گھروں کو روشن اور گرم رکھنے کے لیے دھوپ سے کس طرح کام لیا جاتا ہے؟
۵ - شمسی چولہے سے کیا مراد ہے؟
۶ - سورج کے علاوہ حرارت اور کن ذرائع سے حاصل کی جاتی ہے؟
۷ - اگر پاکستان میں وسیع پیمانہ پر شمسی توانائی حاصل کرنے میں کامیابی ہوگئی تو اس سے کیا فوائد حاصل ہوں گے۔
۸ - مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔ ذی روح، تمازت، محدود، معروف، مقاصد، لاتعداد، بُود و باش
۹ - مندرجہ ذیل جملوں کو مکمل کیجیے:-

(ا) سورج میں ...... گیس کی کثیر مقدار موجود ہے۔
(ب) یہ سیل دُھوپ کو ...... بجلی میں تبدیل کرتے ہیں۔
(ج) ان دھوپ چولہوں میں ...... کی ضرورت نہیں پڑتی۔
(د) دھوپ معمولی چولہے سے لے کر ...... چلانے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔

اُردو زبان وادب

(۱)

اپنے عروج کے دور میں مسلمانوں نے دنیا کے جس خطے پر بھی قدم رکھا، وہاں کی عام زندگی میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ ان کے شاندار ماضی کی تاریخ سے اس کی لا تعداد شہادتیں فراہم ہوتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی ان کی آمد رحمت سے کم نہ تھی۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے یہاں کی تمدنی اور معاشرتی فضا کو بالکل بدل کر رکھ دیا بلکہ ایک نئی زبان کو وجود میں لانے کا باعث بھی بنے جسے آج اُردو کہا جاتا ہے۔ اُردو ہمارے بزرگوں کی عظیم میراث ہے جس کی حفاظت، ترقی اور فروغ ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ ہم گھروں میں کوئی بھی زبان بولتے ہوں لیکن اُردو سے کنارہ کش نہیں ہو سکتے کہ یہ زبان ہمارے قومی اتحاد اور یک جہتی کی علامت ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے شمالی ہند میں صوبہ سرحد سے لے کر الٰہ آباد تک صرف ایک زبان بولی جاتی تھی جسے شورا سینی پراکرت کہا جاتا تھا۔ اس کی ایک بڑی شاخ مغربی ہندی تھی جو مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں میں بولی جاتی تھی اور اسی مناسبت سے الگ الگ ناموں سے موسوم تھی مثلاً اودھ میں اسے "اودھی" کہا جاتا تھا۔ آگرہ، بھرت پور اور متھرا کی زبان "برج بھاشا" کہلاتی تھی۔ ہریانے میں "ہریانوی" کا دور دورہ تھا اور دہلی، میرٹھ اور سہارنپور میں "کھڑی بولی" کا سکہ چلتا تھا۔ موجودہ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں اس زبان نے "لہندا" کے نام سے رواج پایا جس کی محسوس صورتیں آج کی پنجابی، سندھی، سرائیکی اور ہندکو ہیں۔

مشہور مسلمان سپہ سالار محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے قبل عرب تاجروں کے بہت سے خاندان جنوبی ہند کی بعض ریاستوں میں وارد ہو چکے تھے۔ ان میں اور مقامی باشندوں میں بہت کچھ ربط ضبط بھی پیدا ہو چکا تھا لیکن یہ تعلق زبان کے سلسلے میں کوئی زیادہ بار آور ثابت نہ ہو سکا۔ محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ اور ملتان میں عربوں کی آمد بھی زبان میں زیادہ تبدیلیوں کی موجب نہ بن سکی۔ ہاں، اتنا ضرور ہوا کہ سندھی زبان میں بہت سے عربی الفاظ شامل ہو گئے، لیکن زبان کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی ایسی نمایاں تبدیلی نہ آئی۔

سلطان محمود غزنوی کے برصغیر پر حملوں کے بعد پنجاب اور سرحد مستقل طور پر سلطنت

غزنی میں شامل کر لیے گئے اور لاہور یہاں کا دارالحکومت قرار پایا۔ یہاں سپاہیوں اور حکومت کے دوسرے کارندوں کے علاوہ عام مسلمان بھی ایک بڑی تعداد میں آباد ہو گئے۔ اس طرح مقامی آبادی سے ان کا میل جول پیدا ہُوا اور رفتہ رفتہ ان کی زبان مقامی زبان پر اثر انداز ہونے لگی۔ یہیں سب سے پہلے مسلمان نہ صرف یہ کہ مقامی زبان کو بول چال میں استعمال کرتے ہیں بلکہ اس میں شعر بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ غزنوی دَور کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان کے بارے میں یہ بات عام طور سے کہی جاتی ہے کہ اس نے عربی اور فارسی کے علاوہ ایک دیوان ہندی میں بھی ترتیب دیا تھا جو مقامی زبان پر اس کی مہارت کا ایک واضح ثبوت ہے۔

غزنوی سلطنت کے خاتمے پر محمد غوری فتح کے پھریرے اڑاتا ہُوا برِّصغیر کے میدانوں میں وارد ہُوا۔ اُس نے دہلی کو دارالحکومت قرار دیا اور مفتوحہ علاقوں کے اِنتظام کے لیے قطب الدّین ایبک کو اپنا نائب السّلطنت مقرر کر دیا۔ غوری کی وفات پر ایبک نے یہاں باقاعدہ اِسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس عہد میں مقامی باشندوں اور مسلمانوں میں مزید اختلاط بڑھا اور لین دین اور دیگر باہمی ضرورتوں نے اُنھیں ایک دُوسرے کی زبان سے الفاظ مستعار لینے پر مجبور کر دیا۔ اب دارالسّلطنت میں لِسانی تغیّرات کا سلسلہ شرُوع ہُوا جہاں کھڑی بولی عوامی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ خاندانِ غلاماں کے بعد وقتاً فوقتاً متعدد خاندان برسرِ اقتدار آئے اور مسلمانوں کے مذہب، معاشرت، تہذیب اور زبان نے مقامی باشندوں پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے اور لِسانی تبدیلیوں کا عمل بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اسی دَور میں امیر خسروؒ پیدا ہُوئے جنھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ مقامی زبان میں بھی شاعری کی اور ہندی اور فارسی راگوں کی آمیزش سے کئی نئے سُر اور راگ ایجاد کیے۔ امیر کے دوسخنے، انمل اور پہیلیاں اس ابتدائی عہد کی اُردو کا بڑا اچھا نمونہ ہیں۔ اُنھوں نے ہی سب سے پہلے فارسی بحروں میں ہندی شعر کہنے کا کامیاب تجربہ کیا اور یوں اس شاعری کی بنیاد پڑی جس نے بعد میں دکن اور شمالی ہندوستان میں فروغ حاصل کر کے فارسی کی جگہ سنبھال لی۔ اسی دَور میں صوفیاء کی ایک بڑی تعداد نے تبلیغ اسلام کے لیے مقامی زبانوں کو ذریعۂ اظہار بنایا اور کہیں براہِ راست وعظ و تلقین اور کہیں شاعری کے ذریعے اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ صوفیاء کی یہ کوششیں اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں بے حد معاون ثابت ہوئیں۔

علاؤ الدّین خلجی کی فتوحاتِ دکن کے نتیجے میں دِلّی کے باشندے ایک بڑی تعداد میں جنوبی ہند میں آباد ہو گئے، پھر محمد تغلق کے دارالسّلطنت کی تبدیلی نے دہلی کی پوری آبادی کو دولت آباد (دکن) میں بس جانے پر مجبور کر دیا۔ اگرچہ بادشاہ نے یہ حکم جلد ہی واپس لے لیا لیکن سوائے چند دولت مند افراد کے باقی آبادی وہیں مقیم رہی۔ یہ لوگ وہی زبان بولتے تھے جو دلّی میں بن سنور

رہی تھی اور جسے آج کی اُردو کی ابتدائی شکل کہنا چاہیے۔ دکن میں رفتہ رفتہ اس زبان نے بڑی ترقی کرلی، یہاں تک کہ اس میں باقاعدہ شعروشاعری اور نثر نگاری کا آغاز بھی ہوگیا۔

مغلیہ دور برِصغیر میں تہذیب، تعلیم، تمدن اور معاشرت کے اعتبار سے انتہائی ترقی کا دور ہے۔ مغل حکمرانوں کی فیاضی اور سخاوت کا شہرہ ایران و توران سے لوگوں کو یہاں کھینچ لایا۔ مغل درباروں میں علماء و شعرا کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی۔ اس دور میں مقامی باشندوں اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں میں انتہائی میل جول پیدا ہُوا اور اس زبان کے نقش و نگار اُبھرنے لگے جسے بعد میں اُردو کا نام دیا گیا۔

اُردو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی۔ آغاز میں اسے "ہندوی" کہتے تھے۔ پھر ہندی کہنے لگے۔ اس کا ایک نام "ریختہ" بھی تھا۔ جنوبی ہند میں اسے "زبانِ ہندوستان" بھی کہا گیا لیکن آخرکار اتفاق اُردو ہی پر ہُوا۔ انگریزوں کے عہد میں بعض مصلحتوں کے تحت اسے "ہندوستانی" کا نام بھی دیا گیا لیکن اس کا چلن نہ ہو سکا اور اُردو، اُردو ہی رہی۔

اُردو کی ساخت میں مقامی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بعد میں مغربی اقوام کی آمد اور ان سے باہمی ربط ضبط کے نتیجے میں اس میں پرتگالی، لاطینی اور انگریزی کے الفاظ بھی شامل ہو گئے۔

اُردو میں جب شاعری کی ابتداء ہوئی اس وقت مسلم ہندوستان کی تہذیب اپنے پُورے عرُوج پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری نے اپنے تمام اصُول فارسی سے لیے۔ اصنافِ سخن، وزن اور بحو کے پیمانے، تشبیہات و استعارات، شعر کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنے کے معیار سبھی فارسی کا عطیہ ہیں۔

حضرت امیر خسروؒ دہلوی اور بعض دُوسرے بزرگوں کی ابتدائی کوششوں کو چھوڑ کر اُردو میں باقاعدہ شاعری کا آغاز دکن میں ہُوا۔ چودھویں صدی عیسوی میں بہمنیوں کے دَور میں اُردو نظم کی سب سے قدیم کتاب کا سراغ لگا لیا گیا ہے۔ یہ فخر الدّین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ بہمنی سلطنت کے خاتمے پر دکن میں پانچ آزاد اور خود مختار سلطنتیں وجود میں آگئیں، جن میں عادل شاہی بیجاپور اور قطب شاہی گول کنڈہ اُردو زبان اور ادب کی ترقی کے لیے بڑی شہرت رکھتی ہیں۔ وجہی۔ غوّاصی۔ ابن نشاطی، نصرتی، محمد قلی قطب شاہ اور قاضی محمود بحری اس دور کے مشہور شعراء ہیں۔ دکنی دَور کا خاتمہ ولی اورنگ آبادی پر ہوتا ہے جس کا کلام خیال، زبان اور طرزِ بیان کے اعتبار سے اردو شاعری کا نہایت ترقی یافتہ کلام ہے۔ ولی کا دیوان دلّی پہنچا تو وہاں اہلِ فن کی آنکھیں کھلیں اور اُنھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی شعر گوئی کی جانب توجہ کی۔ دلّی

میں ابتدائی دور کے مشہور شعراء میں شاہ مبارک آبرو، محمد شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون، غلام مصطفیٰ خان یک رنگ اور شاہ ظہور الدین حاتم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے بیشتر ولی کی پیروی کی۔ اس دور میں ذومعنی الفاظ کے استعمال پر بڑا زور ہے جسے اصطلاح میں "ایہام گوئی" کہتے ہیں۔ اس روش کو شاہ حاتم نے ترک کیا اور ان کے بعد شعراء کی وہ کھیپ آتی ہے جس نے اُردو شاعری کو ہر اعتبار سے ترقی دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ان میں مرزا محمد رفیع سودا میر تقی میر، خواجہ میر درد، خواجہ میر اثر، خواجہ میر سوز اور میر حسن وہ بزرگ ہستیاں ہیں جنھوں نے اُردو غزل، قصیدہ، مثنوی اور دیگر اصناف کو مضمون اور اسلوب میں فارسی شاعری کے ہم پلہ کردیا۔ خاص طور سے غزل اس دور میں معراجِ کمال پر پہنچی۔ ان بزرگوں کے بعد شیخ غلام ہمدانی مصحفی، میر انشاء اللہ خان انشاء اور شیخ قلندر بخش جرأت نے اپنے اپنے انداز میں سخن سرائی کی اور اردو زبان اور شاعری کو مزید نکھارنے اور سنوارنے کا فریضہ انجام دیا۔ اس دور میں اردو کے بعض بزرگ شعراء نے روزگار کی تلاش میں لکھنؤ کا راستہ لیا اور تھوڑی ہی مدت میں وہاں بھی شاعری کا ایک الگ دبستان قائم ہوگیا جس کی نمائندگی آتش اور ناسخ کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں مرثیہ گوئی نے بڑا فروغ پایا۔ میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر کے مرثیے اُردو شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ دلّی میں اس دور میں شاہ نصیر، ذوق، مومن، غالب اور بہادر شاہ ظفر نے اُردو شاعری میں قابلِ قدر اضافے کیے۔ اسی دور میں آگرے میں نظیر اکبر آبادی اپنی عوامی شاعری سے میلوں ٹھیلوں کی رونق بڑھا رہے ہیں اور نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں لوگوں کو زندگی بسر کرنے کے رموز سکھا رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے یہ بساط لپیٹ دی۔ انگریزوں کے پاؤں جمے تو انگریزی تعلیم کو بھی فروغ ہُوا۔ اُردو شاعری بھی انگریزی اثر سے آزاد نہ رہی۔ نئی طرز کی نظموں کی ابتداء ہوئی اور پُرانے مضامین کی جگہ نئے موضوعات نے لے لی۔ اس کو باقاعدہ تحریک کی شکل مولانا محمد حسین آزاد نے نئی طرز کا مشاعرہ قائم کرکے دی جس میں مصرعِ طرح کی بجائے کوئی عنوان مقرر کردیا جاتا تھا اور شعراء کو آزادی ہوتی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں اس پر نظم کی صورت میں اظہارِ خیال کریں۔ آزاد کے ساتھ اس تحریک میں مولانا حالی بھی شریک تھے۔

سرسید کی تحریک کے اثر سے جہاں زندگی کے دُوسرے شعبوں میں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں شعر و ادب کی فرسودہ روش کو بدلنا بھی ضروری سمجھا گیا۔ حالی نے سرسید کی فرمائش پر اپنا مشہور مسدس کہا اور سرسید ہی کے اثر سے بہت سی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں بھی کہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی ابتداء میں سرسید کی تحریک کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے "مثنوی صبح اُمید

کی۔ یوں اُردو میں قومی شاعری کی ابتداء ہوئی جسے بعد میں جوش ملیح آبادی، ظفر علی خان، اور حفیظ جالندھری نے اپنی شاعرانہ کاوشوں سے بہت آگے بڑھایا۔ ہمارے ادب میں اقبال ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے ہاں ہماری قومی شاعری فکر اور فن کی اِنتہائی رفعتوں سے آشنا ہوئی۔ ان کی شاعری نے صحیح معنوں میں ایک مردہ قوم میں از سرِ نو زندگی کے آثار پیدا کیے۔ نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ کر جگایا اور ان میں جدوجہد اور عمل کے جذبات بیدار کیے۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ سرسیّد کے دَور میں اکبر الٰہ آبادی نے اپنی نظموں، قطعات اور رباعیوں میں جدید تعلیم اور تہذیب کے بعض مُضر پہلوؤں پر بڑی کڑی نکتہ چینی کی۔ ان کی طنزیہ شاعری ہماری قومی زندگی کے لیے کئی وجوہات کی بنا پر مفید ثابت ہوئی۔ قومی تحریکوں کے زیرِ اثر اس دَور میں شعراء کی توجہ بیشتر نظم گوئی ہی پر رہی۔ لیکن اس کے فوراً بعد بعض شعراء نے غزل کو اپنایا اور نئے سرے سے اس کی مقبولیت کا باعث بنے۔ اس ضمن میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، یاس یگانہ چنگیزی اور فراق گورکھ پوری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۳۶ء سے ہمارے ادب میں نئی نئی تحریکیں چلیں جنھوں نے اُردو شاعری کو فکر وخیال اور طرز و اسلوب کی بعض نئی سمتیں عطا کیں۔ اس دور میں جو شعرا سامنے آئے ان میں اختر شیرانی، احسان دانش، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، میراجی، یوسف ظفر، ن۔م۔ راشد اور مختار صدیقی کے نام نمایاں ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد جن شعراء نے اُردو شاعری کو نئی اُمنگوں اور نئے ولولوں سے ہم آہنگ کیا ان میں احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، ضمیر جعفری، فارغ بخاری، جعفر طاہر، ظہیر کاشمیری، حمایت علی شاعر، جمیل الدین عالی، مصطفیٰ زیدی، ابن انشاء، احمد فراز اور شکیب جلالی ہمارے ادب کی جانی پہچانی شخصیتیں ہیں۔

مشق

۱۔ حسب ذیل الفاظ اور ترکیبوں کے معنی بتاتے ہوئے اُنھیں اپنے جُملوں میں استعمال کیجیے:
لا تعداد۔ اختلاط۔ نائبُ السّلطنت۔ آمیزش۔ دارالحکومت۔ دارالسّلطنت۔ نشوونما۔ نقش ونگار۔ مقیم۔ لِسانی تغیّرات۔ جنم داتا۔ تسلّط۔ عقیدت۔ بالخصوص۔

۲۔ "اردو ہماری قومی زبان ہے" ۔ اسے عنوان بناکر ایک مضمون لکھیے جو تین صفحوں پر مشتمل ہو۔

۳۔ حسب ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:۔ ا۔ اُردو زبان کس طرح وجود میں آئی؟
ب۔ مختلف وقتوں میں اُردو کو کن کن ناموں سے پکارا گیا؟
ج۔ کیا اُردو کی ابتدائی نشوونما میں پاکستان کے علاقوں کا بھی کوئی حصّہ ہے؟
د۔ اُردو کن معنوں میں ہمارے قومی اتحاد کی علامت ہے۔
ر۔ اُردو نظم و نثر کا آغاز کہاں ہوا؟
س۔ پاکستان کے پانچ ادیبوں اور شاعروں کے نام بتائیے۔

اُردو زبان و ادب

(۲)

اردو شاعری کی طرح اُردو نثر کا آغاز بھی دکن سے ہُوا، چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلی دریافت شدہ تصنیف حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی کتاب "معراج العاشقین" ہے۔ اس کے بعد متعدد بزرگوں نے تبلیغِ دین کی غرض سے اُردو میں رسائل تصنیف کیے۔ ان میں حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ دکن ہی میں مشہور شاعر ملا وجہی نے نثر کی مشہور "سب رس" تصنیف کی جو ادبی نقطۂ نگاہ سے قدیم اردو میں ممتاز مقام کی مالک ہے۔ شمالی ہندوستان میں اردو نثر کی قدیم ترین کتاب فضلی کی "دہ مجلس" یا "کربل کتھا" تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کے بعد مرزا محمد رفیع سودا کے کلیات کا دیباچہ ہے اور پھر انشا کی دو کہانیاں "رانی کیتکی" اور "سلک گوہر" ہیں جنھیں اُردو نثر کے قدیم نمونوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے قرآنِ حکیم کے ترجموں کے ذریعے سادہ نثر نگاری کے بڑے عمدہ نمونے پیش کیے۔ انگریزوں نے بنگال میں اپنی کامیابیوں کے بعد کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی جس کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازمین کو مقامی زبانوں کی تعلیم دینا تھا چنانچہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نگرانی میں ایک شعبہ قائم ہُوا جس کے اہتمام میں نصاب کی کتابیں تیار ہوتی تھیں۔ یہ کتابیں بیشتر ترجمہ ہوتی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج سے اُردو کے جو ادیب وابستہ ہوئے ان میں میر شیر علی افسوس، میر امّن دہلوی اور حیدر بخش حیدری کی کتابیں اب بھی بہت مقبول ہیں۔ بالخصوص میر امّن کی "باغ و بہار" اُردو نثر کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں نے نصابی ضرورتوں کے تحت سادہ اور عام فہم نثر لکھنے کا طریقہ اپنایا اور پُرانے مشکل اور تکلّفات سے پُر اسلوب کو یکسر ترک کر دیا۔

اردو نثر میں غالبؔ کے خطوط بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ غالبؔ نے اپنی شاعری کے برخلاف خطوط میں ایسی نثر لکھی ہے جسے معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی بخوبی سمجھ سکتا اور اس سے لُطف اندوز ہو سکتا ہے۔ مکتوب نویسی میں غالبؔ نے لمبے چوڑے آداب و القاب کا پُرانا طریقہ ترک کر دیا اور خط لکھنے کا وہ انداز پیدا کیا جس سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دو آدمیوں میں بالمشافہ گفتگو ہو رہی ہو۔

اُردو نثر کی ترقی میں یہ تمام کوششیں بڑی وقعت رکھتی ہیں۔ لیکن اُردو کو صحیح معنوں میں علمی اور ادبی زبان بنانے میں سرسیّد اور ان کے رُفقاء کی کاوشیں ہماری نثر کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ سرسیّد نے نثر کو اپنے اصلاحی لائحۂ عمل کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ اس مقصد کے لیے اخبارات اور رسائل جاری کیے جن میں عام فہم اور سادہ اسلوب اختیار کیا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی بات سمجھ سکیں۔ ان کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" ان کی تحریک کا زبردست ترجمان تھا۔ سرسیّد نے تاریخ، مذہب، ادب، تعلیم، معاشرت اور سیاست پر بہت کچھ لکھا۔ مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے مقالات متعدد جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں اور اردو ادب کا لازوال سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ سرسیّد کے ساتھ ان کی تحریک میں مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی اور نواب وقار الملک جیسی ہستیاں شامل تھیں جنھوں نے اُردو نثر کے دامن کو اپنی تحریروں سے بے حد وسیع کیا۔ اُسی دَور میں لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد نے نہایت شگفتہ، شاعرانہ اور سلیس نثر میں اپنی تصانیف پیش کیں جو اندازِ بیان کے حسن اور دل کشی کے باعث آج بھی اہلِ ذوق کی آنکھ کا سُرمہ ہیں۔ سرسیّد، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، اور علامہ شبلی نعمانی اُردو نثر کے "عناصرِ خمسہ" شمار ہوتے ہیں۔ یہی وہ پانچ بزرگ ہیں جنھوں نے اپنے علمی اور ادبی شہ پاروں سے اُردو کو ایک باوقار زبان بنا دیا۔

سرسیّد کے دَور کے بعد مولانا وحید الدین سلیم، مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، سیّد سجاد حیدر یلدرم، سیّد سلیمان ندوی، میر ناصر علی دہلوی، مولانا عبدالحلیم شررؔ، منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، اور علامہ نیاز فتح پوری نے اپنے اپنے دائرۂ کار میں اُردو نثر کو وسعت دینے کی کوشش کی۔

اصناف کے اعتبار سے بھی اب اُردو نثر نے بڑی ترقی کی۔ علمی ادبی مضامین، ناول، مختصر افسانہ، ڈرامہ اور تنقید کے لیے راہیں ہموار ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے موضوعات کی گونا گونی میں ہماری نثر دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے لگی۔

غیر مُلکی تسلّط سے آزادی کی تحریکیں جب قوّت حاصل کرنے لگیں تو ہمارے ادیبوں نے بھی غلامی افلاس، جہالت اور ظُلم کے خلاف قلم اُٹھایا۔ ادب میں ترقّی پسند تحریک اسی دَور میں وجود میں آئی جس سے اپنے وقت کے صفِ اوّل کے ادیب وابستہ تھے۔ اس تحریک سے الگ رہ کر بھی ادیبوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے طور پر ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دیتی رہی۔ اس عہد میں جن بزرگ ادیبوں کی تحریروں نے شہرت حاصل کی اُن میں قاضی عبدالغفار، احمد شاہ پطرس بخاری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، میاں بشیر احمد، مولانا صلاح الدین احمد، سیّد امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع، سیّد عابد علی عابد، چراغ حسن حسرت، سیّد احتشام حسین، خواجہ احمد عبّاس، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، علی عبّاس حسینی،

ڈاکٹر تاثیر، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر سید عبداللہ، حسن عسکری اور غلام عباس کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کو یہاں کی قومی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ سرکاری اور نجی سطح پر اس کے فروغ اور ترقی کے لیے بڑی قابلِ قدر کوششیں ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ بعض دیگر انجمنوں اور اداروں کے علاوہ انجمنِ ترقیٔ اُردو کراچی، اُردو اکیڈمی لاہور، ترقیٔ اُردو بورڈ لاہور اور مجلس ترقیٔ ادب لاہور حکومت اور عوام کی امداد اور تعاون سے اس سلسلے میں شبانہ روز سرگرمِ عمل ہیں۔ قومی اور ملّی تقاضوں نے ہمارے ادیبوں میں ایک نیا اور توانا احساس پیدا کر دیا ہے۔ انہیں اپنی مٹی سے شدید پیار ہے، اور ان کی تحریروں میں اسی کی خوشبو رچی بسی ملتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، ابن انشا، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور بے شمار ادیب اس وقت پاکستانی ادب میں گراں قدر اضافہ کر رہے ہیں۔

مَشق

۔ القمر اور الشمس پر آپ غور کیجیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پہلے لفظ کی ادائیگی میں ل کا پڑھنا ضروری ہے جب کہ دُوسرے لفظ میں ل کو "شدّ" کے ذریعے ش کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور ل تحریر میں ہوتے ہوئے بھی پڑھنے میں نہیں آیا۔ اس طرح کی صورتوں میں ایسے تمام حروف جن کے ساتھ ل کا پڑھنا ضروری ہو، حروفِ قمری کہلاتے ہیں اور جن حروف کے ساتھ ل کا پڑھنا غیر ضروری ہو، حروفِ شمسی کے ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً عبدالرّحیم، عبدالرّشید، عبدالرّؤف وغیرہ ناموں میں ل تحریر میں تو ہے لیکن پڑھنے میں نہیں آرہا۔ چنانچہ یہاں حرف "ر" کو شمسی حرف کہیں گے۔ اس کے برعکس عبدالحمید، عبدالقیوم، عبدالہادی وغیرہ ناموں میں ل تحریر میں بھی ہے اور پڑھنے میں بھی آرہا ہے۔ چنانچہ یہاں ح، ق، ہ حروفِ قمری کہلائیں گے۔ آج کے سبق میں دارالحکومت اور دارالسّلطنت دو لفظ آئے ہیں۔ پہلے لفظ میں 'ح' قمری حرف ہے جبکہ دُوسرے لفظ میں 'س' شمسی۔

قواعد دانوں نے حسبِ ذیل حروف کو شمسی حروف میں شامل کیا ہے۔

[ت، ث، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ل، ن]

اس کے برعکس یہ حروف حروفِ قمری میں شامل ہیں۔

[ا، ب، ج، ح، خ، ع، غ، ف، ق، ک، م، ہ، و، ی]

آپ اپنے اساتذہ کرام کی مدد سے کم از کم ایسے دس الفاظ اپنی کاپی میں درج کیجیے جن میں پانچ میں حروفِ قمری کا استعمال ہُوا ہو اور پانچ میں حروفِ شمسی کا۔

یاں سودا دست بدستی ہے

دُنیا ہے جس کا نام میاں، یہ اور طرح کی بستی ہے
یہ مہنگوں کو تو مہنگی ہے اور سستوں کو یہ سستی ہے
یاں ہردم جھگڑے اُٹھتے ہیں، ہر آن عداوت بستی ہے
گر مست کرے تو مستی ہے اور پست کرے تو پستی ہے
کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اِس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے۔ یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کا مان رکھے تو اُس کو بھی ارمان ملے
جو پان کھلاوے پان مِلے، جو روٹی دے تو نان ملے
نقصان کرے نقصان مِلے، احسان کرے احسان ملے
جو جیسا جس کے ساتھ کرے پھر ویسا اُس کو آن ملے
کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اِس ہاتھ کرو، اُس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

جو اَور کا اُونچا بول کرے تو اس کا بول بھی بالا ہے
اور دے پٹکے تو اُس کو بھی کوئی اور پٹکنے والا ہے
بے جُرم خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے
اس ظالم کے بھی خوں کا یہاں پھر بہتا ندی نالا ہے
کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اِس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کو ناحق میں کوئی جھوٹی بات لگاتا ہے
اور کوئی غریب بچارہ ہے حق ناحق میں لُٹ جاتا ہے
وہ آپ بھی لُوٹا جاتا ہے اور لاٹھی پاٹھی کھاتا ہے
جو جیسا جیسا کرتا ہے، وہ وَیسا وَیسا پاتا ہے
کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اِس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

ہے کھٹکا اس کے ساتھ لگا، جو اور کسی کو دے کھٹکا
اور غیب سے جھٹکا کھاتا ہے، جو اور کسی کو دے جھٹکا
چھرے کے بیچ میں چھرہ ہے، پٹکے کے بیچ میں ہے پٹکا
کیا کہیے اور نظیرؔ آگے، ہے روز تماشا جھٹ پٹ کا

کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اِس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے
(نظیرؔ اکبر آبادی)

مشق

۱۔ درج ذیل بند کو سادہ نثر میں لکھیے:۔

جو اور کا اونچا بول کرے، تو اس کا بول بھی بالا ہے اور دے پٹکے تو اس کو بھی کوئی اور پٹکنے والا ہے
بے جوم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے اس ظالم کے بھی خوں کا یہاں پھر بہتا ندی نالا ہے

کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اِس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

۲۔ بستی، مستی، پستی، پرستی، بالا، والا، ڈالا، نالا، چار چار لفظوں کے ان مجموعوں پر اگر آپ غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ پہلے چار لفظ آپس میں ہم آواز ہیں، اسی طرح دوسرے چار لفظ ان سے الگ ہیں، لیکن باہم ہم آواز ہیں۔ پھر آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ لفظوں کے یہ مجموعے یکساں حروف پر ختم ہوتے ہیں۔ اور آخری حرف سے قبل یکساں قسم کی حرکات (زبر، زیر، پیش) بھی رکھتے ہیں۔ بَسْ تِی، مَسْ تِی، پَسْ تِی، پَرَسْ تِی۔ بَالَا، وَالَا، ڈَالَا، نَالَا۔ اس طرح کے مزید ہم آواز الفاظ اگر آپ تلاش کریں تو آپ کو ان میں حرکات اور حروف کی یکسانیت کا احساس ہوگا۔ ایسے تمام الفاظ کسی نظم یا غزل میں بدل بدل کر آتے ہیں۔ انہیں شاعری میں "قافیہ" کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ الفاظ جو قافیے کے بعد آتے ہیں اور بار بار بغیر کسی تبدیلی کے دہرائے جاتے ہیں "ردیف" کہلاتے ہیں۔ مثلاً اس نظم کے پہلے بند کے چھ مصرعوں میں "ہے" ردیف ہے۔ اسی طرح دوسرے بند کے پہلے چار مصرعوں میں "ملے" ردیف ہے۔ ردیف اور قافیے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قافیہ بدلتا رہتا ہے، لیکن ردیف ہمیشہ جوں کی توں رہتی ہے۔ آپ کی کتاب میں جو نظمیں شامل ہیں ان میں سے قافیہ اور ردیف کی کم از کم دس مثالیں تلاش کرکے کاپی میں نقل کیجیے۔

۳۔ نظیرؔ اکبر آبادی کی اس نظم سے آپ کیا سبق حاصل کرتے ہیں؟

۴۔ (۱) "جنابِ صدر، آج کے موضوع پر کچھ عرض کرنے سے قبل میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دوسری

سیّد امیر علی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں کٹک کے مقام پر ۴ اپریل ۱۸۴۹ء کو سید سعادت علی کے فارغ البال گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کے متعلق کسے معلوم تھا کہ یہی بچہ کچھ عرصہ بعد ایک عظیم اسلامی قانون دان، بلند پایہ مؤرخ اور دو قومی نظریات کا داعی سید امیر علی ہوگا۔

سید امیر علی کے آباؤ اجداد خراسان سے نادر شاہ کے ہمراہ ہندوستان میں آئے اور پھر ہندوستان کو ہی وطن بنا لیا۔ سید صاحب نے ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جلد ہی اردو، فارسی پر بھی دسترس حاصل کرلی۔ فارغ وقت میں کشتی کرنا، تیغ زنی، گھوڑ سواری، نشانہ بازی اور باغبانی سے بھی شغل رکھتے تھے۔

ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہگلی کالج میں داخل ہوئے اور پھر قانون کی سند کی اور اس کے بعد جلد ہی حکومتِ برطانیہ کے وظیفے پر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان روانہ ہوگئے۔ اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے تقریباً ۱۸ سال کی عمر میں ہی انگریزی زبان میں اتنے ماہر ہو چکے تھے کہ نوعمری میں ہی ایک بلند پایہ عالم سید کرامت علی کی تصنیف "مخزنِ علوم" کا انگریزی میں ترجمہ کیا جس کا تعلیم یافتہ طبقے میں بہت چرچا ہوا۔ اس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر انگریزی زبان میں ایک جامع مقالہ لکھا جس سے سید امیر علی کی شہرت میں خاصا اضافہ ہوا۔ سید صاحب نے انگریزی پڑھی اور اتنی اچھی پڑھی کہ خود انگریز اُن کی انگریزی دانی کا لوہا مان گئے۔ جب انگریزی رسالوں اور اخباروں میں قومی مسائل پر سید امیر علی کے مضامین چھپتے تو انگریز خود دنگ رہ جاتے، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے دین پر قائم رہے اور اپنی قوم سے انھیں جو محبت تھی اس میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی قانون کو اپنا خاص مضمون بنایا۔ سید صاحب جب گورنر جنرل کی کونسل کے رکن بنے تو اس میں بھی مسلمانوں کے حقوق کی پاسبانی کرتے رہے اور مرتے دم تک ہر معاملے میں اور ہر موقع پر ان کا ذہن، زبان اور قلم مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور اُن کی بہبود کے لیے سرگرم عمل رہے۔

سید امیر علی کی گھریلو تربیت اور ابتدائی تعلیم کا ہی اثر تھا کہ وہ ہمہ وقت اپنے ملک اور قوم کے مستقبل کے متعلق سوچتے رہے۔ انگلستان میں قیام کے دوران انھوں نے "نیشنل انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک جماعت قائم کی جس سے ہندوستانی طلبہ کو بہت فائدہ پہنچا۔ انگلستان

سے بیرسٹری کی سند حاصل کرکے جب وہ واپس وطن پہنچے تو تھوڑے ہی عرصہ میں اسلامی قانون کے ماہر سمجھے جانے لگے. چنانچہ کچھ ہی دن بعد کلکتہ یونیورسٹی میں "مسلم لا" کے لیکچرر مقرر ہوئے یونیورسٹی میں ایک گھنٹہ پڑھانے کے بعد باقی وقت میں وکالت کرتے تھے. بعد میں کلکتہ کے پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

سیّد صاحب جب بنگال کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تو انہیں یہ دیکھ کر نہایت دکھ ہُوا کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے باوجود اُنھیں نمائندگی نہیں دی جارہی۔ اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے اُنھوں نے ۱۸۷۷ء میں "نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک انجمن بنائی جس کی شاخیں جلد ہی مدراس، چٹاگانگ، پنجاب اور کراچی میں بھی قائم ہوگئیں. سیّد صاحب کے پیشِ نظر اس انجمن کی تشکیل کا ایک خاص مقصد تھا. اُنھوں نے اپنی دُور اندیشی سے معلوم کر لیا کہ انگریز حکومت کے نظام میں دُور رس تبدیلیاں ہونے کو ہیں. اگر مسلمانوں نے خود کو ان تبدیلیوں کے لیے تیار نہ کیا تو ہندو سیاسی میدان میں بہت آگے نِکل جائیں گے اور نتیجے کے طور پر اگر مسلمانوں کو انگریز حکومت سے نجات مِل بھی جائے تو ہندوؤں کے محکوم ہوکر رہ جائیں گے. اس لیے ان کی دُور اندیشی نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو سیاسی تربیت دے کر ہندوؤں کے برابر لاکھڑا کرنے میں ہی مسلمانوں کی مصلحت ہے. یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان ہر طرح انگریزوں کے ظلم وستم اور انتقام کا نشانہ بنائے جارہے تھے اور مسلمانوں کو بھی انگریزوں سے سخت نفرت تھی یہاں تک کہ انگریزی زبان کا سیکھنا بھی قابلِ نفرین سمجھا جاتا تھا. اس انتہائی مشکل وقت میں جب مسلمانوں کے اُبھرنے کی تمام اُمیدیں ختم ہوچکی تھیں تو سیّد امیر علی نے سیاسی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے برِّصغیر کے مسلمانوں کو جگانے اور اپنا مقام پیدا کرنے کی ترغیب دی. اُنھوں نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ حالات اب اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی جائے اس کی بجائے علم اور قلم کے ہتھیاروں سے غلامی کے خلاف جنگ لڑنا ہوگی. ان کے خیال میں مسلمان جدید علوم میں مہارت حاصل کرکے ہی اپنے لیے زیادہ سے زیادہ تحفّظات حاصل کر سکتے تھے. خود انھوں نے مسلمانوں کے مفاد اور حقوق کے تحفّظ کے لیے ہندوستان کے انگریز افسروں سے لے کر انگلستان میں مقیم وزیرِ ہند تک سے ملاقاتیں کیں اور یہ ثابت کیا کہ حکومتِ برطانیہ نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں سے ناروا سلوک برت کر اور انھیں حکومت میں حصّہ دار نہ بنا کر بڑی اہم غلطی کی ہے. اس سلسلے میں وزیرِ ہند نے آپ سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفّظ کی تجاویز طلب کیں اور ان پر عمل بھی کیا.

سیّد امیر علی نے ۱۸۹۱ء میں ایک کتاب "دی سپرٹ آف اسلام" اور بعد میں "اے شارٹ

ہسٹری آف سیراسینز" لکھ کر یہ بھی ثابت کر دیا کہ آپ ایک ماہر سیاست دان اور قانون دان ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ مؤرّخ بھی ہیں۔ انھوں نے تاریخی حقائق اس انداز میں پیش کیے جن سے ثابت ہوگیا کہ غیر مسلم مؤرّخین نے اپنی تاریخی کتب میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا حقائق سے دُور کا بھی تعلق نہیں رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ امیر علی ایک سچے مسلمان تھے جنھوں نے اسلام کی وکالت کا پُورا پُورا حق ادا کیا ہے۔ آپ نے "قانونِ شہادت" اور "ضابطۂ دیوانی" کی کتابیں لکھ کر اپنے بلند مرتبہ قانون دان ہونے کا ثبوت پیش کیا۔

۱۹۰۶ء میں جب برِصغیر کے مسلمانوں نے اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے "آل انڈیا مسلم لیگ" کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی تو اس وقت سیّد امیر علی انگلستان میں تھے۔ انھوں نے مسلم لیگ کی ایک شاخ "لنڈن مسلم لیگ" کے نام سے قائم کر کے ایک مرتبہ پھر ثابت کر دیا کہ آپ اپنے دل میں اپنی قوم کے لیے کتنا درد رکھتے تھے۔ "لنڈن مسلم لیگ" کے افتتاح کے موقع پر دو قومی نظریے کی وکالت کرتے ہوئے انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ ہندوستان میں دو بڑی اور علیحدہ علیحدہ قومیں ہندو اور مسلمان کے رہن سہن کے طریقے، مذہب، سوچنے کے ڈھنگ اور رسم و رواج ایک دُوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں قوموں کے لوگ ایک ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے، ایک برتن میں پانی نہیں پی سکتے، آپس میں شادیاں نہیں کر سکتے۔ ہندو مذہب کوئی مذہب نہیں ہے۔ ہندو معاشرے میں باہر کا کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا اور اسے جمہوری سمجھنا سراسر غلط ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایک جمہوری مذہب ہے۔ اس کا ایک مکمل ضابطۂ حیات اور معاشی نظام ہے۔ ہندوستان کی ان قوموں یعنی ہندو اور مسلمان کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں۔ ایک قوم کو دوسری قوم کے تابع یا محکوم نہیں بنانا چاہیے۔

سیّد امیر علی نے ان خیالات کے ذریعے سے جو دو قومی نظریہ اپنے زمانہ میں پیش کیا، وہی نظریہ تینتیس۳۳ برس بعد پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد بنا اور یہ اس نظریہ کی صداقت تھی کہ انگریز اور ہندو پاکستان کے مطالبے کی معقولیت تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک برِصغیر پاک و ہند میں جو حالات رہے ان سے یہ ثابت ہوگیا کہ سیّد امیر علی کا دو قومی نظریہ اور مسلمان قوم کے لیے ان کی سیاسی جنگ بالکل جائز تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے خطبۂ صدارت میں اسی دو قومی نظریے اور مسلمانوں کے اکثریتی علاقے میں ایک آزاد اور خود مختار اسلامی حکومت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا۔ اس کے دس برس بعد قائدِ اعظم محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں یہی مطالبہ اپنے اٹل قومی فیصلے کے طور پر قرارداد پاکستان کے نام پر پیش کیا۔

سید امیر علی کا ۳ اگست ۱۹۲۸ء کو انتقال ہو چکا تھا ورنہ یقین ہے کہ وہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کے مطالبے کی بھی حمایت کرتے اور مطالبۂ پاکستان کے حق میں بھی آواز اٹھاتے جسے اگست ۱۹۴۷ء میں قائد اعظم محمد علی جناح نے حاصل کر دکھایا۔ چونکہ وہ زندگی بھر دو قومی نظریے کی پُرجوش وکالت کرتے رہے اور اس کی حمایت میں ہر ممکن طریقے سے سرگرم رہے اس لیے اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پاکستان کا قیام سید امیر علی کے اس خواب کی تعبیر بھی ہے، کہ ہندوستان کی سر زمین پر مسلمان قوم کا ہندو قوم سے ایک الگ وجود قائم ہے۔

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل محاورات کے معنی لکھیے اور اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
چار چاند لگنا۔ لوہا ماننا۔ دنگ رہ جانا۔ دسترس حاصل کرنا۔ چرچا ہونا۔ حقوق کی پاسبانی کرنا۔ نشست و برخاست۔

۲۔ درج ذیل الفاظ کو واحد میں تبدیل کیجیے۔
مسائل۔ مضامین۔ حقوق۔ علوم۔ تحفظات۔ حقائق۔ مؤرخین۔ کتب۔ ماہرین۔

۳۔ ہمارا وطن پاکستان دو قومی نظریے کے تحت حاصل کیا گیا تھا۔ دو قومی نظریہ سے کیا مراد ہے؟ تفصیل اپنی کاپی میں لکھیے۔

۴۔ سید امیر علی کی تصانیف کی فہرست مرتب کیجیے اور بتائیے کہ یہ کتب کن موضوعات پر لکھی گئیں؟

۵۔ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے قیام سے سید امیر علی کے سامنے کون سا خاص مقصد تھا؟

۶۔ سید امیر علی نے انگریزوں کی غلامی کے خلاف جنگ لڑنے کا کون سا طریقہ اختیار کرنا بہتر سمجھا اور کیوں؟

۷۔ "ہندو اور مسلمان دو قومیں ایک دوسرے کی ضد ہیں" اس پر مختصر نوٹ لکھیے۔

۸۔ اعراب لگائیے۔ مشغل۔ مخزن علوم۔ تحفظ۔ انجمن۔ غلطی۔

صنعت ریشم سازی

انسان ایک ایسے دور سے بھی گذرا ہے جب وہ ہزاروں سال قبل ہر قسم کے لباس سے بے نیاز تھا۔ غیر متمدّن انسان نہ غسل کرتے اور نہ ہی کوئی لباس پہنتے تھے۔ آج بھی دنیا میں بعض علاقوں میں ایسے لوگ آباد ہیں جو برہنگی یا نیم برہنگی کو ایک فیشن اور زیادہ کپڑے پہننا بُرا سمجھتے ہیں، تاہم ہر زمانے میں موسم کی سختی سے بچنے، خوب صُورتی اور ستر پوشی کے لیے جانوروں کی کھالوں، درختوں کے پتّوں اور چھال کے ریشوں سے کسی نہ کسی طرح تن کو ڈھانپنے کی فکر لاحق رہی۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا لباس کی وضع قطع میں بھی غیر معمولی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔

یورپ، افریقہ، امریکہ اور مصر کی قدیم تہذیبوں میں کئی سال پہلے عمدہ ململ کا رواج ہوا لیکن کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ چین میں تیار ہونے والا ریشم کس طرح تیار کیا جاتا ہے اور ہزاروں سال تک چین سے باہر کوئی بھی اس راز سے واقف نہ ہو سکا کہ ریشم حقیقت میں کیا ہے اور کس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ دراصل چینیوں کی تہذیب بہت قدیم ہے۔ جب تمام یورپی اقوام غاروں میں رہتیں اور کھالوں کا لباس پہنتی تھیں اس وقت بھی چینی عورتیں نہایت نرم ریشمی کپڑے استعمال کرتی تھیں، اور اسی ریشم کو آج ترقی یافتہ دور میں بھی فوقیت حاصل ہے۔ لیکن آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ اصل ریشم جس سے قیمتی ملبوسات تیار ہوتے ہیں، حقیقت میں ایک معمولی کیڑے کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔

ریشم کے یہ کیڑے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل چین میں پالے جاتے تھے۔ صدیوں تک یہ کیڑے پالنے کا فن چینیوں تک ہی محدود رہا اور انھوں نے یہ راز کسی دوسری قوم کو نہ بتایا۔ اہل چین کو یہ فن اتنا عزیز تھا کہ بادشاہ اور شاہزادیاں ریشم کے کیڑے پالتی تھیں۔ خود چین کی ملکہ سی لنگ بھی اپنا زیادہ وقت ریشم کے کیڑے پالنے اور ان سے ریشم حاصل کرنے میں گذارتی تھی۔ صدیوں بعد یورپ بھی مہذب بن گیا اور مشرقی ممالک سے تجارت کرنے لگا۔ اس طرح چین کا خام ریشم یورپ پہنچا اور یورپی خواتین نرم و نازک ریشمی کپڑے بڑے مہنگے داموں خرید کر فخر محسوس کرتیں۔ اس کے باوجود کوئی قوم ریشم تیار کرنے کا راز نہ پا سکی۔ آخر چینیوں کا یہ راز فاش ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یورپی اقوام نے یہ راز کس طرح حاصل کیا، یہ بھی ایک بہت دلچسپ کہانی ہے۔ ہُوا یوں کہ ایران کے دو راہب جو چین میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے ۵۵۰ء میں ریشم تیار کرنے اور ریشم کے کیڑوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان راہبوں نے ریشم کے کیڑوں کے انڈے بانس کے

کھوکھلے ٹکڑے میں محفوظ کر لیے اور بڑی چالاکی سے چین سے غائب ہو گئے۔ اس طرح ریشم کا کیڑا چین سے ایران اور یورپ پہنچا۔ آج مغربی ممالک میں ریشم کے جتنے کیڑے پالے جاتے ہیں وہ حقیقت میں ان انڈوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں جو تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل چین سے ان راہبوں نے اڑائے تھے۔ یورپ میں ریشم کی صنعت کا اس طرح آغاز ہوا، لیکن چند صدیوں تک یہ فن یورپ میں بھی چند خاص لوگوں کی ملکیت بنا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ راز کسی ایک قوم یا فرد سے نکل کر ایک عام صنعت بن گیا۔

آپ حیران ہوں گے کہ ایک معمولی کیڑے سے ایک خوب صورت نرم و نازک اور قیمتی کپڑا کس طرح تیار کیا جاتا ہے، یہ کہانی ریشم کے کیڑے کے چین سے یورپ پہنچنے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے یہ ایک ایسی صنعت ہے جس سے ہر آدمی تھوڑی سی محنت کر کے اپنی آمدن میں معقول اضافہ کر سکتا ہے۔ ہماری حکومت بھی اس صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک علیحدہ محکمہ قائم ہے جو ریشم کے کیڑوں کے انڈے مہیا کرتا ہے اور اس طرح حاصل کیا گیا ریشم خود خرید لیتا ہے۔ ان کیڑوں کے انڈے وزن میں بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ تقریباً سات لاکھ انڈوں کا وزن سوا دو سو گرام (ایک پاؤ) ہوتا ہے۔ اس صنعت کے لیے زیادہ ساز و سامان کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ انڈے رکھنے کے لیے گتّے کا ایک بڑا ڈبّہ اور ان سے نکلنے والے کیڑوں کی خوراک کے لیے شہتوت کے پتّوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ گتّے کے ڈبّہ میں احتیاط سے ان انڈوں کو رکھ کر ڈبّہ کسی ایسے کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے جہاں تھوڑی تھوڑی دھوپ بھی آتی رہے۔ دھوپ کی حرارت سے چند دنوں کے بعد انڈوں سے چھوٹے چھوٹے کیڑے نکل آتے ہیں۔ ان کیڑوں کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا شہتوت کے نرم پتّے ڈبّہ میں ڈال دیے جاتے ہیں جو ان کی من بھاتی غذا ہے۔

ریشم کے کیڑے انڈوں سے نکلنے کے بعد بڑی تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں۔ اس لیے ان کیڑوں کو چند دوسرے ڈبّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور خوراک کے لیے شہتوت کے پتّے ڈال دیے جاتے ہیں۔ کیڑے فوراً ہی ان پتّوں کو کھانا شروع کر دیتے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں یہ ننھی مخلوق ڈھیروں پتّے چٹ کر جاتی ہے اس لیے خوراک کے طور پر پتّوں کا انتظام پہلے سے ہی کر دیا جاتا ہے۔ کیڑوں کو تندرست رکھنے اور زیادہ ریشم حاصل کرنے کے لیے ڈبّوں کو صاف رکھنا اور افراط سے خوراک مہیا کرنے کے علاوہ چیونٹیوں سے بچانا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ یہ کیڑے بہت جلد بڑھتے ہیں۔ اس لیے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کو پہلے سے زیادہ جگہ کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ تقریباً تین ہفتوں میں کیڑا ۳، ۴ دفعہ اپنا رنگ بھی بدلتا ہے اور اس کی لمبائی بھی تقریباً پانچ سنٹی میٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ جتنی تیزی سے یہ کیڑے پرورش پاتے ہیں اتنی ہی جلد ان کی عمر بھی ختم ہوتی ہے۔





جس طرح دُوسرے کیڑے بڑھنے کے بعد پروانوں اور تتلیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح ریشم کے کیڑے بھی پروانے بن جاتے ہیں۔ لیکن پروانہ بننے سے پہلے انہیں ایک اور منزل سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ اس منزل سے گذرنے کے لیے ہر کیڑے کو اپنے لیے ایک علیحدہ گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کیڑا خوراک کھانا چھوڑ دیتا ہے اور اپنے نچلے ہونٹ کے دو سوراخوں سے ایک زرد رنگ کا محلول مادہ نکالنا شروع کرتا ہے۔ ہوا لگتے ہی یہ مادہ زرد رنگ کے دو باریک ریشمی تاروں کی شکل میں جم جاتا ہے جن کو ملا کر کیڑا ایک مضبوط دھاگہ بناتا ہے اور اسے اپنے جسم کے گرد لپیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور چار دن بعد کیڑا نظروں سے اوجھل ہو کر زرد رنگ کے ایک خول میں بند ہو کر آرام کی نیند سو جاتا ہے۔ یہ خول کوکون کہلاتا ہے اور اسی سے ریشمی دھاگہ حاصل ہوتا ہے۔

اب کوکون سے ریشمی دھاگہ حاصل کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ ایک کھُلے برتن میں اُبلتے ہوئے پانی میں چھ کوکون ڈال دیے جاتے ہیں۔ پانی کی حرارت سے کوکون نرم اور ملائم ہو جاتے ہیں۔ ہر کوکون کے ایک سرے سے ایک تار نکلتا ہے۔ دو دو تاروں کو آپس میں بل دیا جاتا ہے۔ اسی طرح چھ کوکونوں سے تین تار نکلتے ہیں جن کو آپس میں ملا کر ایک ایسا مضبوط ریشمی دھاگہ حاصل ہوتا ہے جو آسانی سے ریل پر لپیٹ لیا جاتا ہے۔ جب تک یہ عمل مکمل نہ ہو جائے کوکون گرم پانی میں پڑے رہتے ہیں تاکہ نرم اور ملائم رہیں اور ریشمی تار آسانی سے نکلتا رہے۔ اس کے بعد مزید چھ کوکون اُبلتے پانی میں ڈال کر ریشمی دھاگہ حاصل کیا جاتا ہے۔

ریشم حاصل کرنے کا یہ سلسلہ جاری رکھنے کے لیے مزید انڈوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ انڈے یا تو باہر سے خرید لیے جاتے ہیں یا اپنے پالے ہوئے کیڑوں سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ کچھ کوکون علیحدہ کر کے گرم اور تاریک کمرے میں رکھ لیے جائیں تو دو ہفتے سے بھی کم عرصہ میں ان کوکونوں میں سے خود بخود کیڑے پروانوں کی شکل میں باہر نکلتے ہیں۔ ان پروانوں کو ایک ڈبے میں جمع کر کے ان کی خوراک کے لیے شہتوت کے پتے ڈال دیے جاتے ہیں۔ یہ پروانے اُڑ نہیں سکتے اور چند ہی دنوں بعد مادہ پروانے انڈے دینا شروع کر دیتی ہیں اور انڈے دینے کے بعد خود ہی مر جاتی ہیں۔ ایک مادہ چار، پانچ سو انڈے دیتی ہے۔ یہی انڈے فروخت بھی کیے جاتے ہیں اور مزید کیڑوں کے لیے بھی رکھے جاتے ہیں۔

ریشم کی تیاری کچھ مشکل کام نہیں لیکن جب اسے وسیع پیمانے پر جاری رکھا جائے تو اس کام کے لیے وسیع جگہ، شہتوت کے درختوں اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اس صنعت کو گھریلو صنعت کے طور پر اپناتے ہیں جب کہ وسیع پیمانے پر اس کے لیے مختلف قسم کی مشینیں

بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ ریشم اور اس کی تیاری کے مرحلے آج بھی تقریباً وہی ہیں جو آج سے ساڑھے چار ہزار سال قبل ملکہ سی لنگ کے زمانے میں چین میں رائج تھے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں اگرچہ ریشم سازی کی صنعت کافی ترقی کر چکی ہے لیکن اصل ریشم سے ضروریاتِ زندگی پورا کرنا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس لیے جدید مشینوں کے ذریعے سے بعض درختوں کی چھال کے اندرونی گودے کو مشینوں میں مختلف مراحل سے گزار کر ایک قسم کا شیرہ حاصل کیا جاتا ہے اور اس شیرے کو خودکار مشینیں دھاگے کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس دھاگے کو مختلف رنگ دے کر ایسا نفیس کپڑا بُنا جاتا ہے جو اصل ریشم سے کسی طرح کم خوب صورت، ملائم اور آرام دہ نہیں ہوتا۔ کچھ عرصہ قبل مصنوعی ریشم صرف چین، جاپان، انگلستان اور دُوسرے یورپی ممالک میں ہی تیار ہوتا تھا، لیکن اب پاکستان میں بھی مصنوعی ریشم سازی کی صنعت کافی ترقی کر چکی ہے جس سے مختلف قسم کے مصنوعی ریشم کے کپڑے، جرابیں اور دیگر پہناوے تیار ہونے لگے ہیں۔

مَشق

۱ - قدیم زمانہ کی غیر مہذب اقوام کی بود و باش کیسی تھی؟

۲ - مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے:-

تن ڈھانپنا، راز فاش ہونا، من بھاتی، چٹ کر جانا، نظروں سے اوجھل ہونا، خودکار، پہناوے، راہب۔

۳ - قدیم اور نوم گرامر میں کیا ہیں؟ اس طرح کے دس الفاظ لکھیے۔

۴ - مندرجہ ذیل جملوں کو مکمل کیجیے۔

۱- جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا لباس کی .... میں بھی غیر معمولی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔

۲- حقیقت میں ریشم ایک معمولی .... سے تیار ہوتا ہے۔

۳- یہ ننھی مخلوق .... پتے چٹ کر جاتی ہے۔

۴- کچھ لوگ اسے گھریلو .... کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

۵ - ایرانی راہبوں نے کس طرح ریشم کے کیڑے چین سے غائب کیے۔ مختصراً تحریر کیجیے۔

۶ - آپ کو ریشم کے کیڑے کے انڈے دیے جائیں تو اس سے کس طرح ریشمی دھاگہ حاصل کریں گے؟

دستی کام

خالدہ آپا کے شوہر امریکہ میں کسی بڑی فرم میں ملازم ہیں۔ وہ مدّت سے ان کے ساتھ ہی امریکہ میں مقیم ہیں۔ پچھلے چند دنوں سے وہ اپنے وطن واپس آئی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی جان پہچان کے لوگوں اور اپنے خاندان میں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ ایک تو ان کے چہرے پر ہر وقت بشاشت کھیلتی رہتی ہے۔ دوسرے وہ بڑی ملنسار طبیعت رکھنے والی خاتون ہیں۔ ساتھ ہی وہ بچّوں سے بہت محبّت کرتی ہیں۔ ان کو تحفے تحائف امریکہ سے بھیجتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے ان کا خاندان اور دوسرے افراد سے رابطہ قائم رہتا ہے۔

خالدہ آپا کی طبیعت میں وطن کی محبت رچی بسی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وطن سے ہزاروں میل دُور رہتے ہوئے بھی وطن کے لوگوں اور اس کی چیزوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ امریکہ میں پہننے اور برتنے کے لیے وہ ہمیشہ پاکستان سے چیزیں منگواتی رہتی ہیں۔ اس کے لیے اُنھوں نے عجیب اور آسان طریقہ اختیار کیا ہُوا ہے۔ وہ خاندان اور عزیزوں کے بچّوں کے لیے ان کی پسند کی چیزیں امریکہ سے بھیج کو اُن سے فرمائش کر دیتی ہیں کہ پاکستان سے فلاں فلاں چیز ان کو بھیج دیں۔ بچّے اپنی پسند کی چیزیں پاکر بہت خوش ہوتے ہیں اور اپنے والدین کے سر ہو جاتے ہیں کہ خالدہ آپا کو یہ چیزیں فی الفور بھیجی جائیں اس طرح یہ سلسلہ قائم رہتا ہے اور بچّوں اور خالدہ آپا دونوں کو اپنی اپنی پسند کی چیزیں ملتی رہتی ہیں۔

اس دفعہ جب وہ وطن واپس پہنچیں تو ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی عزیزوں کے علاوہ وہ بچے جنھیں وہ تحفے بھیجتی تھیں ان کے گھر بڑی تعداد میں آنے لگے۔ وہ خالدہ آپا کے پاس بیٹھتے، ان سے امریکہ کی باتیں پُوچھتے۔ وہ بھی ان کے ہر سوال کا جواب خندہ پیشانی سے دیتیں۔ بچّے عام طور پر امریکی بچّوں، وہاں کے شہروں اور شہروں میں رہنے والوں کے رہن سہن اور طور طریقے کے بارے میں سوالات پوچھتے خالدہ آپا انھیں شگفتگی سے جواب دیتیں۔ وہاں کے دلچسپ واقعات انھیں سناتیں یہ بچے پہروں ان کی باتیں سننے کے لیے ان کے پاس بیٹھے رہتے۔ وہ تو خیر گذری کہ بچّوں کے سکولوں میں چھٹیاں تھیں، ورنہ انھیں خالدہ آپا کی میٹھی اور دلچسپ باتیں سننے کے لیے سکول سے غیر حاضر ہونا پڑتا جس کی وجہ سے انھیں سزا ملتی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ ایک دن مقامی اخبار میں یہ خبر چھپی کہ شہر میں گھریلو صنعتوں کی

ایک بہت بڑی نمائش کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ سب بچوں نے جب یہ خبر پڑھی تو دوڑے دوڑے خالدہ آپا کے پاس گئے اور ان کو شہر میں نمائش لگنے کی خبر سنائی۔ ساتھ ہی ان سے وعدہ لیا کہ آپا نمائش کے موقع پر بچوں کو نمائش دکھانے کے لیے ساتھ لے چلیں گی۔ آپا خود نمائش دیکھنے کا شوق رکھتی ہیں، اس لیے انھوں نے حامی بھرتے ہوئے بچوں سے کہا کہ "انشاء اللہ نمائش آنے پر ہم سب ساتھ چلیں گے۔"

نمائش لگنے کے دوسرے دن خالدہ آپا تمام بچوں کے ساتھ ایک بس میں بیٹھ کر شہر روانہ ہوئیں۔ راستے میں انھوں نے بچوں کو سمجھانا شروع کیا کہ آج ہماری تمہاری ضرورت کی تمام چیزیں بڑے بڑے کارخانوں میں مشینوں کے ذریعہ بنتی ہیں۔ لیکن آج سے کافی عرصہ پہلے جب مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی، انسان اپنی ضرورت کی چھوٹی بڑی تمام چیزیں اپنے ہاتھ سے بناتا تھا۔ ان ہاتھ سے بنی ہوئی کئی چیزوں میں اتنی اعلیٰ کاری گری دکھائی گئی ہے اور کام اتنی نفاست سے ہوا ہے کہ مشینوں سے ایسا کام ہونا ممکن نہیں ہے۔ آج تم اور میں جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ انھیں کپڑے کے ملوں میں مشینیں تیار کرتی ہیں، لیکن جب انسان کپاس بونے سے کپڑا بننے تک سارے کام ہاتھ سے انجام دیتا تھا اس وقت وہ دوپٹوں اور کرتوں میں استعمال ہونے والی اتنی باریک ململ بناتا تھا کہ دیکھنے والے عش عش پکار اٹھتے۔ مشہور ہے کہ ڈھاکہ میں کاری گر ایسی نفیس ململ بناتے تھے کہ پورا تھان ایک انگوٹھی کے حلقے سے گذر جاتا تھا۔" بچے تعجب سے اچھل پڑے۔ "نہیں آپا! اتنی باریک ململ نہیں بنائی جا سکتی۔" خالدہ نے کہا۔ "پیارے بچو! کاری گروں نے جتنی عالی شان اور نفیس چیزیں ہاتھوں سے تیار کی ہیں اگر میں ان سب کی باتیں آپ کو بتاؤں تو اس کے لیے بڑے وقت کی ضرورت ہے۔

مشینوں کی ایجاد کی وجہ سے انسان نے بہت ترقی کی ہے۔ اس سے اس کے وقت کی بڑی بچت ہوئی۔ کیونکہ مشینیں ایک دن میں جتنا کام کرتی ہیں انسان اتنا کام مہینوں میں بھی نہیں کر سکتا۔ زیادہ چیزیں بننے کی وجہ سے آسانی سے انسانی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ آج بھی بعض کام جو ہاتھ سے کیے جاتے ہیں ان میں اتنی نفاست اور خوب صورتی ہوتی ہے کہ مشینوں سے کیے ہوئے کام میں ممکن نہیں۔ خالدہ آپا نے بچوں کو بتایا کہ جو چیزیں کارخانوں میں بنائی جائیں یا چند اوزاروں کی مدد سے گھر میں تیار ہوں یا کوئی کاری گر انھیں ایک آدھ اوزار کی مدد سے بنائے، اسے صنعتی کام ہی کہا جائے گا۔ ہاں جو اشیاء گھروں یا چھوٹے اڈوں پر کاری گر اوزاروں اور ہاتھ سے تیار کرتے ہیں انھیں گھریلو صنعت کہا جاتا ہے۔ یہ گھریلو صنعتیں ہمارے ملک کے قصبوں اور دیہات میں وسعت سے پھیلی ہوئی ہیں۔ جس مقام پر جو خام مال زیادہ ہوتا ہے، اس

مقام کے لوگ اس خام مال سے اچھی اچھی چیزیں بنا کر ایک طرف اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں تو دوسری طرف اپنی روزی کماتے ہیں۔"

جوں ہی بس نمائش کے بڑے دروازے پر رُکی، خالدہ آپا نے بچوں سے کہا۔ "آہستہ آہستہ اُتر کر نیچے ایک مقام پر کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی بچہ اِدھر اُدھر نہ ہو جائے یہاں بہت بھیڑ ہے۔ اگر خدا نخواستہ کوئی بچہ بھیڑ میں کھو کر رہ گیا تو اُسے تلاش کرنا مشکل ہو گا۔" بچوں کو ایک جگہ کھڑا کرنے کے بعد خالدہ آپا ٹکٹ گھر کی کھڑکی کی طرف لپکیں اور اپنے اور سب بچوں کے لیے نمائش دیکھنے کے ٹکٹ حاصل کیے۔ پھر بچوں کو ساتھ لے کر نمائش کے سٹالوں کی طرف بڑھیں۔ بھیڑ اتنی تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ہر سمت رونق ہی رونق نظر آ رہی تھی۔ مختلف علاقوں کے سٹالوں پر سٹال لگانے والے اپنے اپنے علاقوں کی خوب صورت چیزوں کو سجائے، دیکھنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ آپا کو بچے سٹالوں کی طرف کھینچ رہے تھے۔ آخر انھوں نے فیصلہ کیا اور بلوچستانی سٹال سے سٹالوں کو دیکھنے کا کام شروع کیا۔ بچوں نے بلوچی کڑھائی کے نمونوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ اس میں شوخ رنگ کے کڑھائی کے دھاگوں کو اس خوب صورتی سے استعمال کیا گیا تھا کہ ان کا حسن ہر آنے جانے والوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ لمبے لمبے کرتے جن میں سامنے کی طرف ایک طویل محراب کی جیب لگ رہی تھی۔ شوخ و شنگ رنگ کے دھاگوں سے نفیس کڑھائی بڑی دل آویز تھی۔ کڑھے ہوئے جوتے اور نمدے بھی سٹال پر رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف سنگِ سبز سے بنی ہوئی بہت سی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ خالدہ آپا نے بچوں کو بتایا کہ سنگِ سبز بلوچستان کی خاص پیداوار ہے۔ ایک بچہ انھیں دیکھ کر مچل گیا اور آپا سے کہا کہ وہ سنگِ سبز سے بنا ہوا انگور کا گچھا لے کر دیں خالدہ آپا اس معاملے میں بڑی دریا دل تھیں۔ فوراً بچے کی فرمائش پوری کی۔

یہاں سے وہ سندھ کے سٹال کی خوب صورتی کو دیکھ کر وہاں پہنچ گئے۔ بچوں نے شوخ رنگوں کی کترنوں سے بنی ہوئی ایک چادر نما چیز کو دیکھ کر آپا سے پوچھا۔ آپا یہ کیا ہے؟ آپا نے کہا "اسے رالی کہتے ہیں۔ سندھی عورتیں اور دُوسرے کاری گر درزیوں سے کپڑوں کی کترنیں حاصل کر لیتے ہیں یا مختلف قسم کے شوخ رنگوں کے کپڑے خرید کر انھیں یکساں طور کی کترنوں میں کتر ڈالتے ہیں اور اس سے یہ پُرکشش کھیس جیسی چادر اوڑھنے کے لیے بن جاتی ہے۔ اس قسم کی چادر نما چیز بنا کر اس سے تکیے کوزیاں بھی بنا لیتے ہیں۔" آپا نے بچوں کو سندھی کڑھی ہوئی ٹوپیاں بھی بتائیں جن کی کڑھائی میں شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اِس طرح ٹانک دیا گیا تھا کہ ان کے ستاروں کی طرح جھلملانے سے بڑا دل کش نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ زنانہ کپڑوں پر سندھ میں بھی بلوچستان کی طرح نفیس کام ہوتا ہے اور اسی طرح پسند بھی کیا جاتا ہے آپا نے بچوں کو بتایا کہ سندھ کی خواتین کو کڑھائی

کا شوق اتنا زیادہ ہے کہ اگر کسی خاتون کے پاس پہننے کے لیے دو جوڑے کپڑے بھی ہوں گے تو ان پر ضرور کڑھائی ہوگی۔ سندھ اور بلوچستان کے کڑھائی کے کام کو پاکستان کے علاوہ سمندر پار کے ملکوں میں بڑا پسند کیا جاتا ہے۔" آپا نے بچوں کو کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائیاں، ٹوکریاں اور کھلونے دکھاتے ہوئے کہا —— "سندھ میں کھجور کے پتوں سے بڑی خوب صورت چٹائیاں اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔" بچوں نے آپا کو سٹال کی دوسری جانب خوب صورت دریوں کی طرف متوجہ کیا اور سب انہیں نزدیک سے دیکھنے کے لیے پہنچ گئے۔ نمائش کے نگران نے بچوں کو بتایا کہ یہ خوبصورت دریاں بڑی پائیدار ہوتی ہیں اور تمام عمر ساتھ دیتی ہیں۔ ان دریوں کے اوپر نہایت سلیقے سے جیکب آباد کا منقش فرنیچر سجا ہوا تھا۔ آپا نے بچوں سے کہا کہ "یہ فرنیچر اس علاقے کا خاص تحفہ ہے۔ میں ان چیزوں کو اپنے ہمراہ امریکہ لے گئی تھی۔ جو انہیں دیکھتا تھا، حیران رہ جاتا تھا۔ اور ہمارے ملک کے ان کاری گروں کے کمال پر تحسین و آفرین پکار اٹھتا تھا۔ ان چیزوں کی غیر ملکوں میں بڑی مانگ ہے۔" پھر آپا نے انہیں پتھر کے منقش ڈبے، تصویریں، خوب صورت بیل بوٹوں والے فریم اور سجاوٹ کا دوسرا سامان بھی دکھایا جسے دیکھ کر بچے بہت خوش ہوئے۔ پیپر میشی کے پھول سے ہلکے پھلکے ڈبے جن پر رنگ برنگے پھول، پتیاں اور قسم قسم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، بچوں نے بہت پسند کیے۔ آپا نے کہا —— "بالہ کا یہ کام غیر ملکوں میں بہت پسند کیا جاتا ہے اور وہ بڑی چاہ سے خریدتے ہیں۔

لو! اب ہمارے سامنے پنجاب کا سٹال ہے۔ یہ دیکھو! ڈیرہ غازی خان کے ہاتھی دانت کا کام کس عمدگی، نفاست اور خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ انسان کے ہاتھوں سے اتنا نرم و نازک اور حسین کام سرانجام پا سکتا ہے۔ اس طرف بہاول پور کے مٹی کے ہلکے پھلکے اور منقش برتن توجہ کو کیسے کھینچ رہے ہیں۔" آپا نے ایک لیمپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بچوں سے کہا۔ "دیکھا! کس قدر خوب صورت ہے۔ یہ اونٹ کی کھال سے ملتان میں بنایا گیا ہے۔ یورپ امریکہ اور عرب ممالک میں اس کی بڑی مانگ ہے۔ ذرا ملتانی روغنی مٹی کے برتنوں کو تو دیکھو۔ کتنے پیارے ہیں۔ تلے کا کام، کرتوں کی کڑھائی، شالوں اور چادروں پر رنگ برنگے بیل بوٹے، زیوروں کی یہ مینا کاری، یہ ملتان اور بہاول پور کے مشترکہ تحفے ہیں۔ قصور کے مونڈھے، چارپائیاں اور سیڑھیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔ سیالکوٹ کا کھیلوں کا سامان جو دنیا بھر میں مشہور ہے وہ دوسری طرف رکھا ہوا ہے۔ بچو! آپ نے ملتان، بہاول پور، قصور، سیالکوٹ، ڈیرہ غازی خان کی کاری گری کا کمال دیکھ لیا ہے۔ اب اس گوشے پر نظر ڈالو۔" آپا کے کہنے پر سب بچے اُدھر دیکھنے لگے وہاں دس دس بارہ بارہ سال کی عمر کے بچے اڈوں پر بیٹھے قالین بافی اور ستارے اور موتیوں کے کام کا ماہرانہ مظاہرہ

کر رہے تھے۔ ان کی چابک دستی اور کام کی خوب صورتی دیکھ کر بچے حیران رہ گئے۔

خالدہ آپا نے بچوں سے کہا، "چلو آگے بڑھو۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔ ابھی ہم نے سرحد کا سٹال بھی دیکھنا ہے۔ سرحد کے سٹال پر انھوں نے کئی چیزیں دیکھیں۔ ان میں زری کی چپلیاں تھیں جن پر کیا ہوا کام آنکھوں کو بڑا ہی بھلا لگتا تھا۔ ان چپلیوں کی بہت ملکوں میں مانگ ہے۔ غیر ملکیوں کے لیے یہ بڑا تحفہ ہے۔ یہ پائیدار بھی بہت ہیں۔ انھیں برسوں استعمال کیجیے، کوئی خرابی پیدا نہ ہوگی۔ کلاہ اور واسکٹوں پر جو طِلّے کا کام سرحد میں ہوتا ہے وہ صرف اسی صوبے کے لیے مخصوص ہے۔ ان کلاہوں اور واسکٹوں کو بڑے شوق سے پہنا جاتا ہے۔" سرحد کی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ٹوکریاں، رنگین مٹی کے برتن، اور سجاوٹ کا سامان ساری چیزیں دیدہ زیب تھیں۔ خالدہ آپا نے سرحد کے بیل بوٹوں والے نمدے دکھاتے ہوئے کہا، "سرحد میں بھیڑیں زیادہ پالی جاتی ہیں۔ ان کی اون سے اعلیٰ قسم کے اور خوب صورت نمدے بنائے جاتے ہیں۔ سرحد میں سب سے زیادہ اون قالینوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ایران کے قالین دنیا میں سب سے اعلیٰ شمار کیے جاتے ہیں۔ لیکن سرحد کے قالین بھی نفاست میں ایران کے قالینوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اون سے سرحد کے بعض علاقوں میں پٹی تیار کی جاتی ہے جس سے گرم کوٹ بنائے جاتے ہیں۔ چترال اور شمالی علاقوں کے بیل بوٹوں کے اعلیٰ قسم کے چغے اور براق جیسی سفید چترالی ٹوپیاں بھی سٹال پر موجود ہیں۔ دیکھو، کتنی کاری گری اور خوب صورتی سے بنائے گئے ہیں۔ سرحد میں اون سے گرم کپڑے، شالیں اور کمبل بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ ذرا اِدھر دیکھو! یہ پشم دار چمڑا نظر آتا ہے۔ اِسے قراقلی کہتے ہیں۔ قراقلی کی ٹوپیاں بنائی جاتی ہیں جو غیر ملکوں کو برآمد کی جاتی اور بڑی قیمت پاتی ہیں۔



بچو! آؤ اب نمائش کا آخری سٹال دیکھ لیں۔ یہ کشمیر کی اشیاء کا سٹال ہے۔ اہلِ کشمیر کی کاری گری اور ہُنر مندی ہمیشہ سے مشہور ہے۔ یہاں اخروٹ کی لکڑی پر بیل بوٹوں کی کھدائی کا کام سدا سے مثالی رہا ہے۔ کشمیر کے کاری گر لکڑی پر ہاتھوں سے اتنے نرم و نازک اور خوب صورت بیل بوٹے کھودتے ہیں جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ سامنے دیکھو! آئینے کا چوکھٹا جو اخروٹ کی لکڑی کا ہے، اس پر کتنے حسین نقش و نگار کندہ کیے گئے ہیں۔ یہاں کشمیر کی وہ شالیں بھی موجود ہیں، جن کا صدیوں سے برِّصغیر میں جواب نہیں۔ ذرا ان پر کی گئی گُل کاری اور زردوزی کا کیا ہُوا کام تو دیکھو۔" خالدہ آپا نے انہیں روئی کا نرم بچھونا بھی دکھایا ہے جسے کشمیری زبان میں "گبا" کہتے ہیں جس پر سوزن کاری کے کام کی مہارت دکھائی گئی ہے۔ بچّوں نے کشمیر کے سٹال اور یہاں کے کاری گری کے نمونوں کو بہت پسند کیا۔

خالدہ آپا نے بچّوں سے کہا "اب ہم پاکستان کے ہر علاقے کا سٹال دیکھ چکے ہیں اور چل پھر کر خوب تھک چکے ہیں۔ چلنے پھرنے کی وجہ سے بھوک بھی خُوب چمک اٹھی ہے۔ آؤ کچھ کھا پی لیں۔ آج تم نے اِس نمائش میں جو کچھ دیکھا ہے وہ ہمارے ملک کے مختلف حصّوں کی کاری گری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ مشینوں کے مقابلے میں یہ دستی کام بڑا خوش نما، بڑا نفیس اور بڑا حسین ہے۔ دنیا کے سارے مُلکوں میں اس کی بڑی کھپت ہے۔"

مشق

۱۔ اِس سبق کے آخری پیراگراف سے پہلے پیراگراف میں ایک لفظ آیا ہے۔ سدا، اِسی طرح کا ایک اور لفظ ہے۔ صدا۔ ان میں سے پہلے لفظ کے معنی ہیں ہمیشہ، اور دوسرے لفظ کے معنی ہیں آواز۔ ان کے معانی جدا جدا ہیں لیکن ان کی آواز تقریباً ایک جیسی ہے۔ ایسے الفاظ کو ہم صوت کہا جاتا ہے جیسے قصر اور کسر، بے باق اور بے باک۔ آپ ایسے ہی پانچ ہم صوت الفاظ تلاش کر کے لکھیے اور ان کے معانی علیٰحدہ تحریر کیجیے۔

۲۔ نیچے دیے ہوئے سوالوں کے جواب دیجیے۔

۱۔ گھریلو صنعتوں کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

۲۔ آپ کون سی دست کاری کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟

۳۔ بلوچستان میں ہاتھ سے کیا ہُوا کون سا کام دُوسرے ملکوں میں پسند کیا جاتا ہے؟

۴۔ سندھ میں خواتین کس کام کا زیادہ شوق رکھتی ہیں؟

۵۔ زری چپلیں کون سے علاقے میں بنائی جاتی ہیں؟

۶۔ قراقلی کے بارے میں آپ کو کیا معلوم ہے؟

نئے تقاضے

نئی ہے محفل، نیا غمِ دل
نئے تقاضوں سے لو لگائیں
نئی اُمیدوں میں مسکرائیں
پُرانے خوابوں کو بھول جائیں
کہ مُردہ ماضی کے غم کا حاصل؟ —— نئی ہے محفل

اُٹھیں کہ مغرب نڈھال ہوکر
شکستہ و پائمال ہوکر
پڑا ہے دستِ سوال ہوکر
بجھا کے اپنا چراغِ منزل —— چراغِ محفل

ہم ایک ہیں، ایک کے پجاری
ہمیں مقدر ہے تاجداری
اب آئی ہے پھر ہماری باری
کہ دیں جہاں کو سکونِ کامل —— مسرّتِ دِل

ہمارے خم میں مئے محمّد
ہمارے سر پر فلک کا گنبد
نہیں ہمارے لیے کوئی حَد
ہماری ہر آرزو کا حاصل: —— شکستِ باطل

(یوسف ظفر)

مَشق

۱ - مندرجۂ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے اور ان کے معنی بیان کیجیے۔
مغرب، نڈھال، شکستہ، منزل، مقدر، خم، گنبد، باطل۔

۲ - اپنا چراغ، شکستہ و پائمال، ہماری باری، مسرتِ دل، سکونِ کامل، مئے محمد۔ قواعد کی رُو سے کون کون سے مرکبات ہیں؟ ۳ - اس نظم کے آخری بند کا مطلب بیان کیجیے۔

۴ - ہمارے بزرگوں نے حصولِ پاکستان کے لیے بے اندازہ جد و جہد کی اور بیشمار قربانیاں دیں۔ آپ یقیناً اس حقیقت سے واقف ہوں گے۔ آپ تحریکِ پاکستان سے وابستہ پانچ اہم شخصیتوں کے نام بتائیے۔

مولٰینا محمدّ رسُول خان

ندی کے کنارے ایک گاؤں میں ایک مکان کے اندر ایک نورانی صورت بڑی عمر کے آدمی چارپائی پر بیمار پڑے ہیں۔ ان کے رشتہ دار مغموم صورت بنائے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ سوموار کا دن اور تیسرا روزہ ہے۔ بیمار نے اگلے ہی دن اپنی بڑی صاحب زادی سے کہہ دیا تھا کہ تم آج اپنے گھر نہ جانا۔ اِس دنیا میں میری زندگی کی ایک رات اور ہے۔ اِسی لیے سب پریشان ہیں۔ مریض کے جسم سے ایک نہایت لطیف خوشبو پھوٹ رہی ہے جس نے سارے کمرے کو معطّر کر رکھا ہے۔ اچانک مریض اپنا سر اُوپر اٹھاتے ہیں اور پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ آج کیا دن ہے؟ انھیں بتایا جاتا ہے کہ آج سوموار کا دن ہے۔ پھر سب سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آج پیر کا دن ہے؟ سب کہتے ہیں۔ جی ہاں! آج پیر کا دن ہے۔ اُس کے بعد آپ اپنے سر سے ٹوپی اتارتے ہیں اور دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ دعا کے آخر میں فرماتے ہیں کہ "اے اللہ تو بہتر نگہبان ہے اور تو ہی ارحم الرّاحمین ہے۔" پھر قبلہ کی طرف کروٹ بدلتے ہیں اور گھر والوں کے دیکھتے دیکھتے خالق حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ ان کی وفات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر سمت پھیل جاتی ہے۔ دیہات سے بڑی تعداد میں لوگ ان کے آخری دیدار کے لیے ان کے گاؤں کی سمت آنا شروع کر دیتے ہیں اور دو تین گھنٹے کے اندر اندر اس گاؤں میں ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ دیہات سے یہ خبر نکل کر قصبوں اور شہروں میں پہنچتی ہے۔ راولپنڈی، لاہور، پشاور اور مردان کے بڑے بڑے دینی علما، ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کے اِس گاؤں کی طرف آخری دید کے لیے کِھنچے چلے آتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں آج جس بڑے آدمی سے دنیا محروم ہوگئی، وہ کون ہیں؟ وہ کسی ملک کے تاج دار نہیں تھے۔ نہ وہ بہت بڑے دولت مند یا بڑے زمیندار و جاگیردار تھے۔ لیکن ان سب سے ان کی زیادہ عزت تھی کیونکہ وہ پاکستان کے ایک بہت بڑے دینی عالم تھے۔ اور دینی علم کے سامنے یہ سب چیزیں ہیچ ہیں۔ ان بڑے دینی عالم کو دُنیا مولٰینا محمد رسول خان صاحب کے نام سے جانتی ہے۔

مولٰینا محمد رسول خان صاحب گذشتہ صدی کے دوسرے نصف میں ضلع ہزارہ کے شمالی پہاڑوں کی خوب صورت سر زمین ٹکری نندھیاڑ کے علاقہ کے ایک گاؤں بانیاں تحصیل بٹگرام میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولٰینا محمود علی صاحب ایک اچھے دینی عالم تھے جن کا تعلق

سواتی قبیلے کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ آپ نے اپنی ابتدائی دینی تعلیم اوگی اور سکندر پور کے دینی مدارس میں حاصل کی۔ کچھ عرصہ بوٹی گاڑ ضلع کیمبل پور میں بھی حصول تعلیم کے لیے گئے۔ اس کے بعد آپ نے برِصغیر کی اسلامی درس گاہ دیوبند میں داخلہ لیا۔ دیوبند اب بھارت میں ہے۔ اس وقت دیوبند کا شمار ایشیا کی سب سے بڑی دینی درس گاہوں میں ہوتا تھا۔ برِصغیر پاک وہند کے علاوہ کابل، قندھار، سمرقند وبخارا، چینی ترکستان، انڈونیشیا، ملایا، اور دُور دُور سے مسلمان طلباء اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لیے دیوبند آتے تھے۔ اس دینی درس گاہ میں اسلامی دنیا کے بڑے بڑے علماء نے اسلامی تعلیم حاصل کی اور نامور علمائے کرام یہاں اساتذہ کی حیثیت سے طلباء کو تعلیم دیتے رہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل طالب علم کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مولینا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ جیسے اکابر علمائے دین نے اِس درس گاہ سے علم حاصل کیا اور اس میں استاد کی حیثیت سے پڑھایا۔ مولینا محمد رسول خان نے تین سال تک دیوبند میں تعلیم پائی۔

دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھارت کے صوبہ یو۔پی کے مشہور شہر میرٹھ کے دینی مدرسہ امداد الاسلام میں استاد ہوئے۔ اِس مدرسہ میں آپ نے دس سال تک پڑھایا۔ پھر آپ کی علمی قابلیت کی وجہ سے آپ کو دیوبند سکول کی انتظامیہ نے دیوبند بلایا۔ وہاں مولینا نے ۲۱ سال تک طلباء کو دینی تعلیم دی۔ جن طلباء کو آپ پڑھاتے تھے وہ آپ کے گرویدہ ہوجاتے تھے پڑھانے کے دوران میں اگر کوئی طالب علم سبق کو پُورے طور پر سمجھنے کے لیے سوال کرتا تو آپ اس کے سوال کا جواب نہایت نرمی اور تفصیل سے دیتے تاکہ سوال پوچھنے والا پوری طرح بات کو سمجھ لے۔ آپ طلباء سے نہایت نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرتے۔ کبھی طالب علم کو نہ ڈانٹتے۔ آپ کا رویّہ ہی طلباء کے ساتھ ایسا تھا کہ وہ آپ کی بہت عزت اور بڑا ادب کرتے۔ اگر کوئی طالب علم پہلا آموختہ پوچھنے پر نہ بتا سکتا تو آپ صرف اُسے "بزاخفش" کہہ دیا کرتے۔

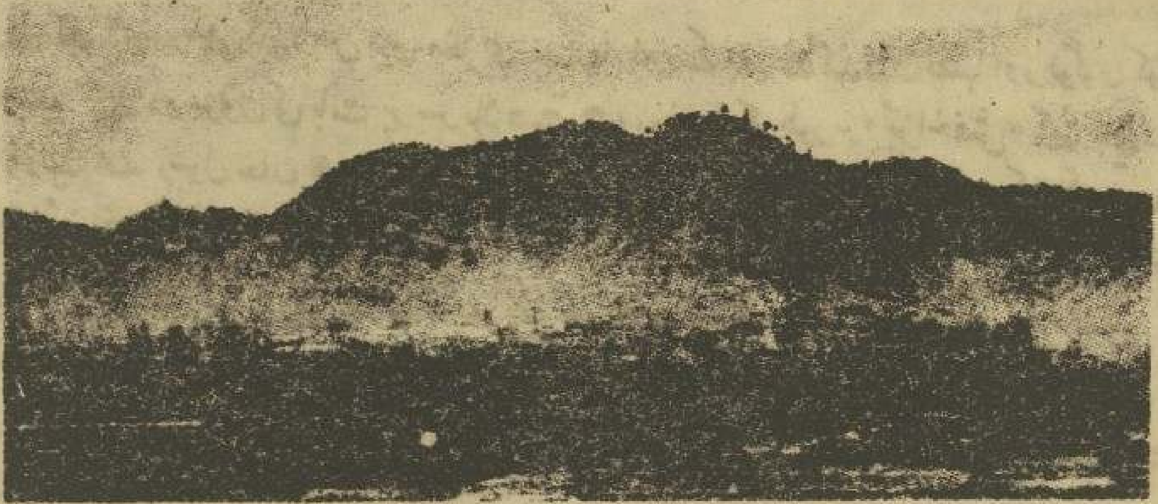
پیارے طلباء! آپ نے "بزاخفش" کے متعلق سنا نہ ہوگا۔ آئیے آپ کو "بزاخفش" کا لطیفہ بھی سُناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پہلے زمانے میں اخفش نام ایک آدمی تھا جو علم نحو حاصل کر رہا تھا۔ اس نے ایک بکری پالی ہوئی تھی۔ فارسی زبان میں بکری کو بُز کہتے ہیں۔ اس لیے لوگ اس بکری کو "بزاخفش" کہا کرتے تھے۔ اخفش جب علمِ نحو کا سبق اپنے استاد سے لے کر آتا تو اپنی بکری کے سامنے بیٹھ کر اس سبق کی گردان کرتا اور یہ گردان اس وقت تک جاری رکھتا جب تک بکری اپنا سر نہ ہلا دیتی۔ جس وقت بکری اپنا سر ہلاتی۔ اخفش سمجھتا کہ بکری نے سر ہلا کر سبق درست ہونے کی توثیق کر دی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب اخفش کی بکری کو قصائی نے خرید نے کے بعد ذبح کیا

تو اس کی کھوپڑی دیکھی گئی۔ اس میں مغز ہی نہ تھا۔ اس کے بعد سے کند ذہن طلبا اور لوگوں کو جو بغیر سوچے سمجھے دُوسروں کی بات پر سر ہلا دیتے ہیں، مذاق کے طور پر "بُزاخفش" کہتے ہیں۔

مولینا محمد رسول خان بھی ان طلبار کو جو پڑھا ہُوا سبق پوچھنے پر نہ بتا سکتے تھے، مذاق کے طور پر "بُز اخفش" کہا کرتے تھے۔ ان کے شاگرد اپنے استاد کے "بُزاخفش" کہنے پر بھی بڑے خوش ہوتے۔ خود مولینا اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ جس شاگرد کو میں جتنی زیادہ بار "بُزاخفش" کہتا ہوں وہ اتنا ہی بڑا عالم ہوتا ہے۔ دیوبند کے تدریسی دور میں ایک طرف آپ کے شاگردوں کی آپ سے شدید محبت تھی تو دوسری طرف دیوبند کے دارالعلوم کے تمام اساتذہ آپ کی تعلیمی قابلیت کا اعتراف کرتے تھے۔

ہمارے ملک کے صوبہ پنجاب کے صدر مقام لاہور میں مشرقی زبانوں کی تحصیل کی ایک بہت پرانی سرکاری درس گاہ ہے جسے اورینٹل کالج کہا جاتا ہے۔ اس کالج کے پرنسپل بڑے بڑے عالم ہوئے ہیں۔ ان میں ایک مولینا محمد شفیع صاحب بھی ہو گذرے ہیں۔ انھوں نے جب مولینا محمد رسول خان کی علمی قابلیت کے بارے میں سُنا تو انھیں اورینٹل کالج میں ملازمت کی پیش کش کی۔ مولینا دیوبند سے فارغ ہو کر لاہور تشریف لائے اور بیس سال تک اس کالج میں عربی زبان کی کتابیں پڑھاتے رہے۔ آپ جو کتاب بھی پڑھانا شروع کرتے، اسے اس دل نشیں طریقے سے پڑھاتے تھے کہ طالب علم کے ذہن میں وہ چیز تمام عمر کے لیے نقش ہو کر رہ جاتی۔

اورینٹل کالج لاہور سے ریٹائر ہوئے تو لاہور کی ایک اور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ میں پڑھانے لگے۔ اِس سکول کی بنیاد مولینا مفتی محمد حسن نے رکھی تھی۔ مفتی صاحب نے آپ سے درخواست کی کہ آپ اِس درس گاہ میں پڑھائیں تاکہ علمِ دین حاصل کرنے والے طلبار کی زیادہ سے زیادہ تعداد آپ سے فیض یاب ہو سکے۔ ہمارے ملک کی دینی درس گاہوں میں شعبان اور رمضان کے مہینوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ آپ بھی ۱۹۷۱ء کے شعبان میں لاہور سے اپنے گاؤں اچھڑیاں تحصیل مانسہرہ میں تشریف لائے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ آپ کی پیدائش بانیاں نام گاؤں میں تحصیل بٹگرام میں ہوئی تھی لیکن بعد میں آپ نے تحصیل مانسہرہ ہزارہ کے اچھڑیاں نام گاؤں میں سکونت اختیار کرلی۔ موجودہ شاہ راہِ ریشم اسی گاؤں کے نزدیک سے ہو کر گذری ہے۔ مولینا محمد رسول خان شعبان کے آخری چند دنوں میں بیمار ہوئے۔ آپ کے نواسے مولینا شفیق الرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ ستائیس شعبان کو آپ کو معمولی سا بخار ہُوا۔ اس سے کمزوری بڑھ گئی اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے مگر اس حالت میں بھی نماز کھڑے ہو کر ادا فرماتے تھے۔ زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تو دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ! میری زبان کی لکنت کو دور فرما کہ میں سورۂ یٰسین پڑھ سکوں۔



مولانا محمد رسول خان کے گاؤں اچھڑیاں کا ایک منظر

موت سے دو دن پہلے مولینا نے اپنے لواحقین سے کہا کہ یہ جرگہ کیوں آیا ہے؛ اِس کے آنے کی کیا غرض ہے۔ لواحقین نے جواب دیا۔ یہاں تو کوئی جرگہ نہیں۔ مولینا شفیق الرحمٰن بتلاتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپ چارپائی پر سخت ضعف اور بیماری کی حالت میں بیٹھ گئے اور ہاتھ آگے بڑھانے لگے جیسے کسی سے مُصافحہ کر رہے ہوں۔ فرمایا۔ جانتے ہو یہ جرگہ کن کا تھا؛ ہم سمجھ گئے کہ یہ جرگہ اللہ پاک کے فرشتوں کا تھا جو اللہ کے اِس نیک بندے کے پاس آخری وقت میں حاضر ہُوا۔ آپ نے دوسرے دن اپنی صاحبزادی کو یہ کہہ کر ان کے گھر جانے سے روک دیا۔ "نہ جاؤ۔ میری آخری رات ہے۔ میں کل آپ سے رخصت ہو جاؤں گا"۔ کہتے ہیں کہ شعبان میں جب آپ لاہور سے گھر آ رہے تھے تو آپ نے اپنے ساتھ وہ کفن بھی رکھ لیا جو آپ کے ایک نیک شاگرد پروفیسر نیاز صاحب حجاز سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کفن پر مولینا نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا کہ یہ میرا کفن ہے۔ آخر رمضان کی تیسری تاریخ کو پیر کے دن ۱۹۷۱ء میں آپ نے اس حالت میں وصال فرمایا کہ آپ کا منہ قبلہ رُخ تھا اور آپ سورۃ یٰسین تلاوت فرما رہے تھے۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون"۔

صوبہ سرحد میں پچھلے دو سو برس میں جتنے بڑے علمائے دین گذرے ہیں ان میں مولینا محمد رسول خان امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ پچھلی دو صدیوں میں برصغیر میں جس قدر نامور علماء گزرے ہیں، ان میں مولینا کا خاص مقام ہے۔ آپ کی عمر میں بھی اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت فرمائی تھی۔ کچھ لوگ اُن کی عمر ۱۲۰ سال بتاتے ہیں اور کچھ لوگ ۱۰۰ سال کہتے ہیں۔ آپ نے جس

دن سے پڑھانا شروع کیا، اس دن سے اپنی عمر کے آخری وقت تک پڑھاتے رہے۔ یہ تدریسی عمر پچپن سال بنتی ہے۔ ان پچپن سالوں میں آپ کے علم سے بے شمار لوگ فیض یاب ہوئے۔ ان لوگوں میں بھارت اور پاکستان کے بڑے بڑے دینی علماء اور پروفیسر شامل ہیں۔ آپ کی وفات کی خبر سن کر ملک کی دینی درس گاہوں اور علمی و دینی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ملک کے بڑے بڑے علماء نے آپ کی علمی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ ان کی وفات سے علم کی ایسی نورانی شمع بجھی ہے جس سے علم کے سینکڑوں چراغ جلے ہیں۔

کہتے ہیں کہ آپ اپنے شاگردوں کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے تھے۔ آپ نے اپنے شاگردوں سے کبھی بھی سختی نہیں برتی۔ آپ کو جب پرانے شاگرد ملتے، تو آپ ان سے اِس قدر تواضع سے پیش آتے کہ وہ شرم محسوس کرتے۔ اور یہ پرانے شاگردوں ہی تک منحصر نہ تھا، بلکہ نئے شاگردوں سے بھی بہت شفقت برتتے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ شاگرد آپ پر اپنی جان نثار کرتے جب وہ فارغ ہوکر بڑے بڑے عالم بن جاتے تو بھی ان کے دلوں میں آپ کی اتنی عقیدت ہوتی کہ وہ آپ کے قدموں میں بیٹھنے کو بڑی سعادت سمجھتے۔ مولینا محمد رسول خان علم کے روشن سورج تھے۔ ان کی وفات سے ملک میں ایک بہت بڑے عالم کی جگہ خالی ہو گئی۔

مَشق

۱ - مولینا محمد رسول خان کا وطن کون سا ہے؟

۲ - آپ نے ابتدائی دینی تعلیم کن اداروں میں حاصل کی؟

۳ - دیوبند کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؛ وضاحت سے بتائیے۔

۴ - مولینا محمد رسول خان نے دیوبند میں کتنا عرصہ تعلیم دی؟

۵ - مولینا محمد رسول خان سے ان کے شاگرد کس لیے زیادہ محبت رکھتے تھے؟

۶ - آپ کی وفات کا حال بیان کیجیے۔

۷ - ذیل کے الفاظ کو نیچے دیے ہوئے جملوں میں خالی جگہوں پر لکھیے۔

عقیدت ، سعادت ، فیض یاب ، مصافحہ ، تلاوت۔

۱۔ میرا بھائی بلاناغہ قرآن شریف کی .... کرتا ہے۔ ۲۔ میں آپ کے ساتھ ہرگز ...... نہ کروں گا۔

۳۔ مولینا محمد رسول خان سے بہت لوگ ..... ہوئے۔ ۴۔ ہمیں اپنے اساتذہ سے ...... ہے۔

۵۔ ماں باپ کی خدمت بڑی ...... ہے۔

تحریکِ پاکستان میں طلبہ کا کردار

پاکستان کا قیام ہر طبقے کی مسلسل اور انتھک جدوجہد کا مرہونِ منت ہے۔ وطنِ عزیز کی خاطر بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر ایک نے قربانی پیش کی اور اس طرح برِ صغیر میں مسلمانوں کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور یہ امر واقعہ ہے کہ جب مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کے قیام کا مطالبہ ہوا تو ساری قوم نے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ ہر شخص کے ہونٹوں پر ایک ہی نعرہ تھا" لے کے رہیں گے پاکستان "۔ پشاور سے چٹاگانگ تک شمع آزادی کے پروانے جوق در جوق ایک جھنڈے تلے جمع ہونے لگے اور پھر وہ گھڑی آئی جب غیر ملکی حکومت یہاں سے بوریا بستر باندھنے پر مجبور ہوگئی۔

آزادی کی اس جنگ میں دوسرے طبقوں کے ساتھ ساتھ مسلمان طلبا بھی شریک ہو گئے چنانچہ جب قائد اعظمؒ نے علی گڑھ میں فرمایا"پاکستان اسی وقت وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہ رہا بلکہ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا اور ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی"۔ تو مسلمان طلبہ فوجِ آزادی کے ہراول دستے میں شامل ہوگئے اور انھوں نے قریہ قریہ اور شہر شہر جاکر قائد اعظم کا پیغام عام کرنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح تحریک پاکستان کو طلبہ کی وجہ سے بہت تقویت پہنچی۔ انھی دنوں جب ہمارے محبوب قائدؒ علی گڑھ تشریف لائے تو طلبا نے فرطِ عقیدت سے اُن کی بگھی کے گھوڑے کھول دیے اور اُسے خود کھینچنا شروع کر دیا۔ طلبہ کا یہ فعل صرف پاکستان سے محبت اور الفت کا مظہر تھا۔

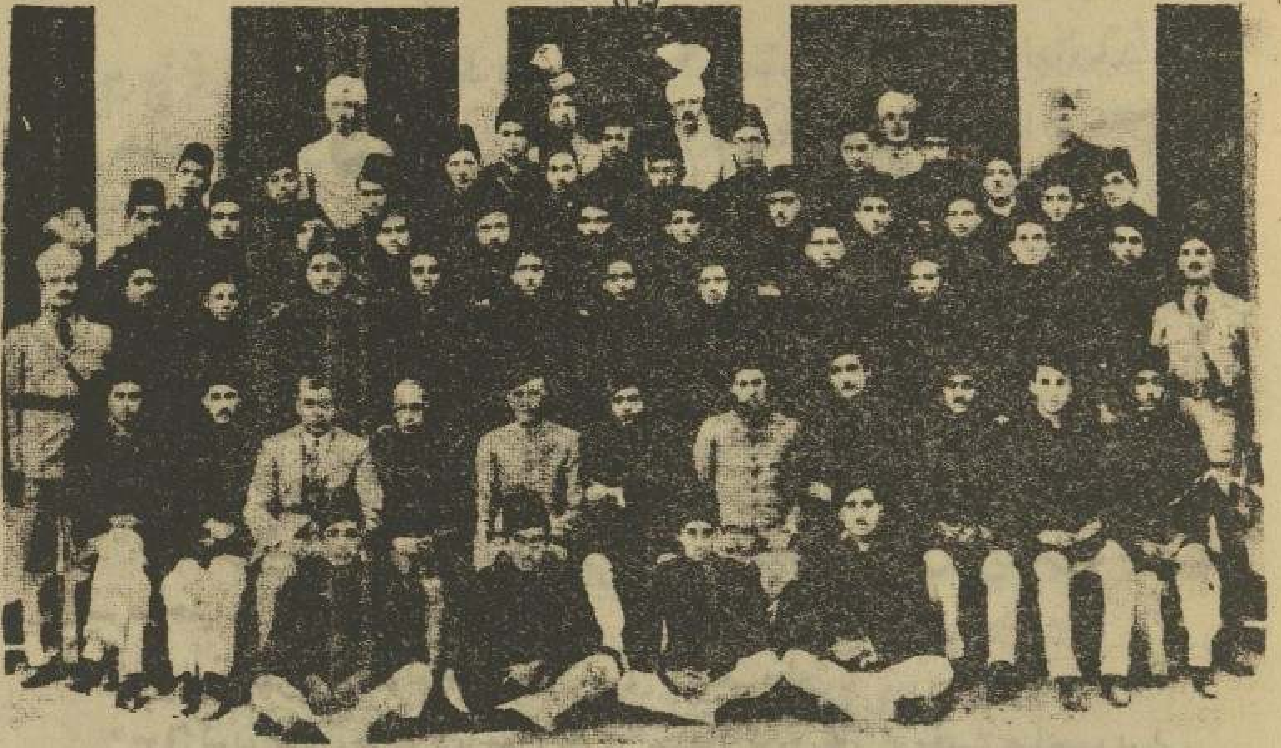
پاکستان کا لفظ بھی ایک نوجوان کی فکری کاوش کا نتیجہ ہے۔ اور یہ نوجوان چوہدری رحمت علی تھے جو اُن دنوں کیمبرج میں تھے۔ آپ نے پاکستان نیشنل موومنٹ کے نام سے ایک تحریک شروع کی اور پاکستان کا لفظ پہلی بار اپنے کتابچے میں استعمال کیا اور اسے کیمبرج سے شائع کیا۔ اس پر جتنے افراد کے دستخط ثبت تھے وہ سب کے سب انگلینڈ میں طالب علم تھے۔ چوہدری رحمت علی نے یہ کتابچہ اُس تاریخی موقع پر لندن میں تقسیم کیا جب گول میز کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کتابچے کے مقدمے میں آپ نے واضح طور پر لکھا" میں یہ اپیل اُن تین کروڑ مسلمان باشندوں کی طرف سے کر رہا ہوں جو ہندوستان کی پانچ شمالی وحدتوں میں بستے ہیں"۔ آپ نے آگے چل کر لکھا۔

"تاریخی حقائق کی روشنی میں ہم بلا خوفِ تردید یہ اعلان کرتے ہیں کہ مسلمان ہندوستانی ہندو کے مقابلے میں قطعاً الگ قومیت رکھتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان کو باقی ہندوستان سے منقطع کر دیا جائے اور ایک ایسا وفاقی آئین دیا جائے جس کی رُو سے ہماری جداگانہ قومی حیثیت مسلّم ہو سکے۔"

جب برِّصغیر میں آزادی کی لہر اُٹھی تو علی گڑھ کے طلبہ نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے تنظیم قائم کی اور راجہ صاحب محمود آباد کو اس کا صدر بنایا۔ یونیورسٹی کے انتخابات کا وقت قریب آپہنچا تھا۔ کانگریس نے بھی اپنا امیدوار کھڑا کیا اور مسلم لیگ نے بھی۔ مگر جب نتائج کا اعلان ہوا تو مسلم لیگ کا امیدوار بھاری اکثریت سے کامیاب ہوا اور یوں مسلمان طلبہ نے اس بات پر مہرِ تصدیق ثبت کی کہ اس وقت مسلمانوں کے بچے بچے کی آرزو پاکستان اور صرف پاکستان ہے۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں نوجوان طلبہ نے جس بے سروسامانی مگر جوش اور جذبے سے حکومت اور ہندو قوم پرستوں کا مقابلہ کیا، اس کی مثال صرف میدانِ کارزار ہی میں مل سکتی ہے۔ ان انتخابات میں مسلمان طالب علم ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئے اور مسلم لیگ کو شاندار کامیابی ہوئی۔ اس سلسلے میں ایک تقریب اسلامیہ کالج لاہور میں لیاقت علی خان کی صدارت میں منعقد ہوئی اور مجاہدِ ملّت کی اسناد اور اعزازی تلواریں ممتاز طلبہ میں تقسیم کی گئیں۔ یہ شاداب اور ہنستے کھیلتے چہرے جب درس گاہوں کی فضا سے باہر لے گئے تو کچھ پیشانیوں پر بل پڑ گئے اور کچھ ہنسی اڑانے لگے، مگر جب انھی طلبہ کے ہاتھوں قائدِ اعظم کا پیغام ہندوستان کے طول و عرض میں پہنچنے لگا تو مخالفین تشدد پر اُتر آئے۔ قوم کے یہ مایۂ ناز فرزند زخمی ہونے لگے اور کٹ کٹ کر میدانِ جنگ میں گرنے لگے۔ لدھیانے میں ایک اٹھارہ سالہ نوجوان خواجہ محمد صدیق پاکستان کے نام پر شہید کر دیا گیا مگر حرّیت کا قافلہ راستے کی مشکلات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا رہا۔ انھی دنوں ایک باپ نے اپنے بیٹے کو جو علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھا، لکھا: "تم کو چاہیے کہ تحریکِ پاکستان کے کام میں کوئی غفلت نہ ہو۔ تم تو اگلے سال بھی امتحان میں بیٹھ سکتے ہو، مگر قوم کا ایسا امتحان ہر سال نہیں آتا۔" اور دنیا نے دیکھا کہ ان غیور اور آزادی کے متوالے طلباء نے قوم کے اس امتحان میں ایسے شاندار پرچے حل کیے کہ جب نتیجہ نکلا تو ایک زمانہ ان کی کامیابی پر رشک کر رہا تھا۔

بدایوں کی اسمبلی کے انتخابات میں بھی علی گڑھ کے طلباء نے نہایت جرأت اور پامردی سے حالات کا مقابلہ کیا اور مسلمان امیدوار کے حق میں گھر گھر جا کر رائے عامہ کو ہموار کیا۔ ایک طرف ہندو امیدوار کی بے پناہ دولت اور دوسری طرف کانگرس کا بے انتہا اثر و رسوخ تھا، مگر ان جیالوں

نے شب و روز خلوصِ نیت سے کام کرکے یہ معرکہ سر کرلیا۔
ابھی منزل کچھ دُور تھی۔ اُفق پر کہیں کہیں صبح کی کرنیں نظر آرہی تھیں۔ آزادی کا قافلہ دل میں یقین کی مشعلیں جلائے اپنے راستے پر گامزن تھا۔ بانگِ درا کو مدھم کرنے کے لیے ناقوس کا بے ہنگم شور بلند ہو رہا تھا اور اس شور میں کلیسا کے گھنٹے کی تیز آواز بھی شامل تھی۔ ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن نے پاکستان کو نامناسب قرار دیا۔ پھر منظر بدلے اور آخری وائسرائے تشریف لائے اور اپنے سیکرٹری سے کہنے لگے "مسٹر جناح مجھ سے گفتگو کرسکتے ہیں مگر فیصلہ میرا ہی رہے گا" قائدِاعظم نے جب یہ بات سنی تو آپ نے للکار کر کہا "دولتِ برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتی ہے، اور گاندھی جی مسلم ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم ان دونوں کو اپنے اوپر حکومت نہیں کرنے دیں گے۔ دونوں متحد ہوکر یا تنہا کوشش کر دیکھیں" آزادی سے چار ماہ قبل لاہور میں کل ہند مسلم مجلس نے پاکستان کے خلاف کانفرنس منعقد کی اور قیامِ پاکستان سے تین دن پہلے قائدِاعظم سے کہا گیا کہ مسلمان جماعتوں کا ایک جلسہ ہونا چاہیے تاکہ یہ طے کیا جاسکے کہ مسلمانوں کا مطالبہ کیا ہے۔ قائدِاعظم نے کہا آپ لیگ میں شامل ہوجائیں۔ مطالبہ خود بخود آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔
قائدِاعظم نے برطانوی سامراج کے آلۂ کار عناصر کے خلاف جہاد کا اعلان بھی پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پلیٹ فارم سے کیا تھا۔ آپ نے پنجاب کی اُس وقت کی حکومت سے کہا کہ وہ مسلم اکثریت کی خواہشات کا احترام کرے اور انگریزوں کی حمایت ترک کردے، لیکن حکومتِ پنجاب نے قائدِاعظم کے مشورے پر کان نہ دھرا اور اُلٹا ان کے خلاف محاذ قائم کردیا۔ اس نازک مرحلے پر طلبہ میدان میں اترے اور پنجاب کے دور افتادہ دیہات تک پھیل گئے۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے کھیتوں اور کھلیانوں سے بلند ہونے لگے۔ اس دور میں ہمارے طلبہ نے جس جوش و خروش اور ایثار سے کام کیا وہ ہماری ملی تاریخ کا روشن باب ہے۔ چنانچہ یہ طلبہ کی مساعی کا ہی نتیجہ تھا کہ اسمبلی کے انتخابات میں مسلمانوں کو عدیم النظیر کامیابی ہوئی اور پنجاب نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس طرح جنگِ پاکستان کا پہلا مورچہ طلبہ نے سر کرلیا۔
آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو شمال مغربی سرحدی صوبے میں ریفرنڈم کا مرحلہ درپیش ہوا۔ صوبے کے بعض سیاست دانوں کے ایما پر یہ مطالبہ کیا گیا کہ سرحد میں پاکستان کے سلسلے میں استصواب رائے کیا جائے۔ چنانچہ اس نازک موقع پر اسلامیہ کالج پشاور اور پنجاب کے طلبہ نے نہایت جرأت، حوصلے اور پامردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور سرحد کے کونے کونے میں جاکر پاکستان کے مخالف عناصر کی قلعی کھول دی۔ ایک مرتبہ قائدِاعظم نے فرمایا "طلبہ میرے معتمد کارکن ہیں اور



تحریکِ پاکستان میں طلبہ نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ "انھوں نے قوم کی تقدیر بدل دی ہے۔" قائدِ اعظم کی جانب سے یہ خراجِ تحسین طلبہ کی ان قومی خدمات کا اعتراف ہے جو انھوں نے غلامی کی سیاہ رات میں اپنے لہو کے چراغ جلا کر سرانجام دی ہیں۔

مشق

۱۔ پاکستان کا لفظ کس نے ایجاد کیا؟

۲۔ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں طلبہ نے کیا خدمات انجام دیں، مختصر طور پر لکھیے۔

۳۔ قائدِ اعظم نے طلبہ کے بارے میں کیا فرمایا تھا؟

۴۔ درجِ ذیل الفاظ کی جمع لکھیے۔

قوم، مطالبہ، سند، مخالف، منزل، خواہش۔

۵۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کے معنی بتائیے۔

قلعی کھولنا، پامردی، مساعی، بوریا بستر باندھنا، اعتراف۔

۶۔ اس سبق میں بانگِ درا، ناقوس اور کلیسا کے گھنٹے کی آواز، جیسے الفاظ آئے ہیں۔ بتائیے ان کا کس طرف اشارہ ہے؟

۷۔ اس سبق سے مرکبات اضافی اور عطفی الگ کیجیے۔

ٹیکسوں کی ادائیگی

پروفیسر نسیم یونیورسٹی سے گھر لوٹے، تو سبھی بچے "ابو آگئے! ابو آگئے!" کہتے ہوئے ان کے استقبال کو آگے بڑھے۔ وہ کسی سے ہاتھ ملاتے، کسی کا گال تھپتھپاتے، کسی کے چٹکی لیتے بیگم کے پاس پہنچے، جو پہلے ہی سے ان کی منتظر تھیں۔

"بڑی دیر کر دی آج آپ نے آنے میں؟" بیگم نے پوچھا۔

"آج مصروفیت کچھ زیادہ رہی، یونیورسٹی کے ایک دو اہم اجلاس میں شریک ہونا تھا۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"اچھا، تو پھر آج تنخواہ نہیں ہوئی ہوگی؟" بیگم بولیں۔

"ہوئی کیوں نہیں، جو کچھ لایا ہوں ضرور حاضر کروں گا۔" پروفیسر صاحب بولے۔

"تو لائیے۔" بیگم نے کہا۔

"اطمینان سے کھانا تو کھا لینے دیجیے۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ آپ کے ہاں روپے پیسے کے علاوہ شاید اور کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔

"ہاں جناب، اگر روپیہ نہ ہو تو اتنے ڈھیر سارے اخراجات کیونکر پورے ہوں؟ آپ کو اور بچوں کو میں کھلاؤں کہاں سے؟ پہناؤں کہاں سے؟" بیگم بولیں۔

"ہاں بھئی، پیسہ تو عورت ذات کی کمزوری ہے۔ آپ اس سے کیسے مبرّا رہ سکتی ہیں؟" پروفیسر صاحب نے ہنس کر کہا۔

"ہاں صاحب، آپ کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ بھی قائم رہیں۔ آپ موٹر بھی رکھیں، بنگلے میں بھی رہیں، دوست احباب کی دعوتیں بھی ہوں، بچے تعلیم بھی پائیں اور آپ یہ بھی چاہیں کہ یہ سب کچھ روپے پیسے کے بغیر ہوتا رہے، تو یہ کیونکر ممکن ہے؟ ان تمام باتوں کا بندوبست تو بہر حال مجھی کو کرنا ہے۔ آپ پیسہ لائیں گے تو یہ سب اللّے تللّے چلیں گے۔" بیگم نے جواب دیا۔

"اچھا صاحب، پہلے کھانا تو کھلائیے، بچے بھی بھوکے ہوں گے۔ کھانا کھا کر آپ سے خوب باتیں ہوں گی۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

سبھی کھانے کی میز پر پہنچے۔ آج بیگم نے کھانے میں خاصا تکلّف کر رکھا تھا۔ میز پر پلاؤ کے علاوہ دو تین قسم کے سالن، فرنی، بھونا ہوا مرغ اور پھل موجود تھے۔ بیگم نے یہ اہتمام اس

لیے غور رکھا تھا کہ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ گذشتہ ماہ کے اخراجات سے جو رقم بچ رہی تھی، اسے انھوں نے اس خیال سے خرچ کر دیا تھا کہ نئی تنخواہ آجائے گی، پھر وارے نیارے ہیں۔ انھیں آئندہ کے خرچ کی بالکل فکر نہ تھی۔ پروفیسر صاحب نے بیگم اور بچوں کے ساتھ چٹخارے لے لے کر یہ سب چیزیں اڑائیں۔ وقفے وقفے سے وہ کھانے کی تعریف بھی کرتے رہے۔ کھانا کھا کر جب سبھی فارغ ہوئے تو بیگم نے تنخواہ کا پھر مطالبہ کیا۔

"اچھا، تو سب بندوبست اسی لیے تھا؟" پروفیسر صاحب بولے۔

"بس بس، باتیں کرنا چھوڑیے۔ پیسے لائیے کہ مجھے آئندہ ماہ کے اخراجات کا میزانیہ تیار کرنا ہے۔" بیگم نے کہا۔

"تو لیجیے صاحب!" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"ہیں! کل پانسو روپے، باقی رقم کہاں گئی؟" بیگم نے کہا۔

"اس ماہ تو اسی قدر ملیں گے۔" پروفیسر صاحب نے جواب میں کہا۔

"اور باقی ایک ہزار کہاں گئے؟" بیگم نے پوچھا۔

"انکم ٹیکس میں کٹ گئے۔" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔

"انکم ٹیکس؟ کہاں کا انکم ٹیکس؟" بیگم بولیں۔

"ہاں صاحب، آپ کو معلوم نہیں کہ آمدنی پر انکم ٹیکس بھی لگتا ہے۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"ہماری آمدنی پر بھی؟" بیگم بولیں۔

"ہاں، ہماری آمدنی بھی جب مقررہ حدود سے تجاوز کر جائے تو اس پر ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"تو پھر سنبھالیے خود گھر کو۔ مجھ سے پانسو روپے میں یہ جنجال نہیں سنبھالا جائے گا۔" بیگم نے برہم ہو کر کہا۔

"دیکھیے بیگم، یہ قصہ سارا سال تھوڑا ہی چلتا رہے گا۔ گھبرائیے نہیں۔ آئندہ آپ کو پندرہ سو روپے ہی ملیں گے۔ صرف جون کے مہینے میں ہمیں انکم ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔" پروفیسر صاحب بولے۔

"تو پھر اس مہینے ڈرائیور کو تو دیجیے چھٹی اور کار کو کیجیے گیراج میں بند۔ گھر میں منہ لپیٹ کر بیٹھ جائیے اور دوست احباب سے ملنا جلنا ترک کر دیجیے۔ خبردار، جو کوئی ہمارے گھر آنے پائے۔ گوشت کا پورے مہینے ناغہ ہوگا۔ دال پکا کرے گی۔ کھانے کے بعد پھل بالکل مہیا نہیں کیے جائیں گے۔ صبح ناشتے کے ساتھ انڈے نہیں ملیں گے۔ سمجھے صاحب!" بیگم نے حکم نامہ جاری کر دیا۔

"آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔ ٹیکس تو ہمیں ادا کرنا ہی ہوگا کہ ایک تو ہم اپنی آمدنی کو چھپا

نہیں سکتے" اور بالفرض ایسا ممکن بھی ہو تو میں سمجھتا ہوں ایسا کرنا قوم و ملک سے غداری کے مترادف ہوگا جس کا ارتکاب کم از کم ہم سے نہیں ہوگا۔ ہم اپنی ضروریات میں تخفیف کر سکتے ہیں۔ ایک آدھ ماہ تنگی سے بسر کر سکتے ہیں لیکن ایسا ہرگز نہیں کر سکتے کہ ہم ٹیکس کے معاملے میں کوئی ہیر پھیر کریں۔ یہ بات ہمیں زیب بھی نہیں دیتی۔ گھبرائیے نہیں یہ مہینہ بھی جیسے تیسے گذر ہی جائے گا۔ آخر وہ لوگ بھی تو زندہ رہتے ہیں جو دن بھر مٹی گارا ڈھو ڈھو کر آٹھ دس روپے پاتے ہیں۔ وہ بھی اہل و عیال والے ہوتے ہیں، وہ بھی بیمار پڑتے ہیں۔ ان کے بچوں کو بھی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے ان کے بھی عزیز، اقارب اور دوست احباب ہوتے ہیں۔ انہیں بعض اوقات بے کار بھی رہنا پڑتا ہے۔ ہمیں ایک مہینے کے لیے تنگی ترشی برداشت کرنا پڑی اور ہم گھبرا اُٹھے۔ ان کی ہر صبح اس فکر کے ساتھ طلوع ہوتی ہے کہ روزی کا بھی کوئی بندوبست ہوگا یا نہیں" پروفیسر صاحب بولے۔

بچے ابھی تک خاموش بیٹھے ابا اور امی کی باہمی گفتگو سُن رہے تھے۔ اب وہ بھی قدرے قریب آگئے۔ ارشد نے ابو سے سوال کرنے میں پہل کی۔

"ابو، یہ انکم ٹیکس کیا ہوتا ہے؟"

"بیٹا، جن لوگوں کی آمدنی ایک خاص حد سے بڑھ جاتی ہے۔ اس پر حکومت ایک خاص شرح سے انکم ٹیکس وصول کرتی ہے۔ پہلے یہ خاص حد تین ہزار روپے سالانہ تھی۔ اب اسے بارہ ہزار روپے سالانہ کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ یہ حد اور بھی بڑھا دی جائے" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"ابو، حکومت انکم ٹیکس کیوں لیتی ہے؟" سعیدہ نے پوچھا۔

"دیکھو بیٹی، یہ تو تم جانتی ہو کہ جس طرح ہم اپنے گھر کے اخراجات بغیر روپے کے نہیں چلا سکتے بالکل اسی طرح حکومت کو ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ملک میں آمدورفت کے لیے سڑکیں اور شاہراہیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ تعلیم کے لیے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کی جاتی ہیں۔ صحتِ عامہ کے لیے ہسپتالوں کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ وطنِ عزیز کے دفاع کے لیے افواج ترتیب دی جاتی ہیں۔ گھروں، گلیوں اور بازاروں میں روشنی کے لیے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ کھیتوں کی سیرابی کے لیے نہریں نکالی جاتی ہیں۔ ٹیوب ویل لگائے جاتے ہیں ملکی ضروریات کے لیے کارخانے قائم کیے جاتے ہیں۔ اس نوع کے لاکھوں منصوبے حکومت کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان پر اربوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ رقم کہاں سے فراہم ہوگی؟ اس مقصد کے لیے آمدنی کے دیگر ذرائع کے علاوہ حکومت مختلف قسم کے ٹیکس عاید کرتی ہے جن میں انکم ٹیکس بھی شامل ہے" پروفیسر صاحب بولے۔

"ابو، کیا حکومت اس سلسلے میں کوئی رعایت بھی دیتی ہے؟" شفیق نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، اس سلسلے میں حکومت ایک نہیں بہت سی رعایتیں دیتی ہے۔ مثلاً آمدنی کا کچھ حصہ ذاتی مصارف کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے ایک خاص رقم پر ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا۔ جو لوگ بچت کر کے اپنی رقم کو ملکی ترقی کے منصوبوں میں لگاتے ہیں، حکومت ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ایسی بچت ایک خاص حد تک ٹیکس سے مستثنٰی ہوتی ہے۔" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔

بیگم صاحبہ کی برہمی بھی اب کسی حد تک دُور ہو چکی تھی اور وہ بھی اس گفتگو میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ اُنھوں نے سوال کیا "کیا حکومت کے تمام مصارف انکم ٹیکس سے پُورے ہو جاتے ہیں؟"

"نہیں صاحب، انکم ٹیکس کے علاوہ حکومت بعض دُوسری قسم کے ٹیکس بھی عاید کرتی ہے۔ مثلاً آپ جانتی ہیں کہ گذشتہ برس آپ کے چھوٹے بھائی اسلم انگلینڈ سے پاکستان آئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ جو مختلف چیزیں لائے تھے ان میں کتابوں اور بعض دیگر اشیاء کو چھوڑ کر باقی چیزوں پر انھیں دو ہزار روپے کسٹم ادا کرنا پڑا تھا۔ آپ کے ابّا ایک متوسط درجے کے زمیندار ہیں۔ انھیں زمینوں کی آمدنی پر لگان بھی دینا پڑتا ہے۔ ہم نے چار برس قبل جو مکان بنوایا تھا اور کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ اس پر بھی تو ہم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ تو صاحب، صرف انکم ٹیکس ہی نہیں، دیگر ٹیکسوں سے بھی حکومت سرمایہ فراہم کرتی ہے، اور رفاہِ عامہ کے کاموں پر صرف کرتی ہے۔ چونکہ یہ تمام رقم خود ہماری فلاح و بہبود پر صرف ہوتی ہے اس لیے ہمیں ان ٹیکسوں کی ادائیگی میں کوئی تامّل نہیں ہونا چاہیے۔" پروفیسر صاحب بولے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شفیق درمیان میں بول پڑا۔

"ابّا جان، گذشتہ برس ہم ریڈیو اور ٹیلی وژن پر خفیہ دولت کے بارے میں اکثر سُنتے رہے ہیں، یہ کیا چکر ہے؟"

"بیٹا! بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ٹیکس سے بچنے کے لیے اپنی بیشتر دولت چھپائے رکھتے ہیں۔ انھیں اس کا قطعاً احساس نہیں کہ انھوں نے جو کچھ کمایا ہے وہ اسی ملک کے طفیل میں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ان کی آمدنی میں یہاں کے غریب عوام بھی شریک ہونے پائیں۔ اسی لیے حکومت کو ان کی خفیہ دولت باہر لانے کے لیے مختلف اقدامات کرنا پڑے۔" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔

"ابّو، یہ تو خیانت ہے۔ جب حکومت سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہماری جان و مال کی حفاظت کرے، ہمارے لیے تعلیم کا معقول بندوبست کرے، ہمیں صحت کی سہولتیں مہیا کرے، ہمارے لیے سڑکیں اور شاہراہیں تعمیر کرائے، تو ہم کیوں نہ ایمان داری سے اُسے ٹیکس ادا کریں۔"

سعیدہ بولی۔

"ہاں بیٹی، ہم سب کو اِسی انداز میں سوچنا چاہیے۔ یہ خود ہمارا ملک ہے۔ اس کی ترقی اور تعمیر ہم ہی کریں گے۔ اس کے عوام کی خوشحالی ہماری خوشحالی ہے۔ ہمیں ذاتی طور پر کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے لیکن وطن کی تعمیر اور ترقی میں ہمیں اپنا کردار ضرور ادا کرنا چاہیے۔ ذاتی مفاد کوئی چیز نہیں۔ مِلّت کا مفاد ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔" پروفیسر صاحب نے بتایا۔

سب بہت خوش ہو چکی تھی۔ اب بیگم نسیم کی برہمی بالکل دور ہو گئی تھی۔ وہ چائے کا انتظام کرنے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ بچے ابا کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

ا۔ ٹیکسوں کی ادائیگی کیوں کر ضروری ہے؟

ب۔ انکم ٹیکس کے علاوہ حکومت اور کون کون سے ٹیکس وصول کرتی ہے؟

ج۔ کیا انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے اپنی دولت چھپائے رکھنا ایک اچھا فعل ہے؟

د۔ جو لوگ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے اپنی دولت پوشیدہ رکھتے ہیں ان کے سلسلے میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟

۲۔ حسب ذیل الفاظ اور تراکیب کے معنی بتائیے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

مُنتظر، مبرّا، اہتمام، میزانیہ، الٹے تلّے، وارے نیارے، تخفیف، تنگی ترشی، اہل و عیال، مستثنٰی، تامّل۔

۳۔ جن جملوں میں کوئی بات کسی سے دریافت کی گئی ہو انھیں سوالیہ جملے کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے جملوں کے آخر میں سوالیہ علامت (؟) آتی ہے۔ آج کے سبق میں جہاں جہاں سوالیہ جملے آئے ہیں انھیں الگ کر کے اپنی کاپی میں لکھیے۔

۴۔ جمع کے واحد اور واحد کے جمع بتائیے۔

اخراجات، افواج، ملک، مصارف، اشیاء، احساس، شریک، مفاد۔

۵۔ خالی جگہوں کو پُر کیجیے۔

ا۔ آپ کے شاہانہ ——— بھی قائم رہیں۔ ب۔ نئی تنخواہ آجائے گی پھر ——— ہیں۔

ج۔ آپ پیسہ لائیں گے تو یہ سب ——— چلیں گے۔

د۔ ذاتی مفاد کوئی چیز نہیں، ہمیں مِلّت کا ——— ہمیشہ ——— رکھنا چاہیے۔

ماں کا خوابؔ

میں سوئی جو اِک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے مِرا اضطراب

یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ مِلتی نہیں

لرزتا تھا ڈر سے مِرا بال بال
قدم کا تھا دہشت سے اُٹھنا محال

جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی

زمرّد سی پوشاک پہنے ہُوئے
دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہُوئے

وہ چُپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں؟

اِسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
مجھے اس جماعت میں آیا نظر

وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
دِیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا

کہا میں نے پہچان کر میری جاں!
مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟

جُدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار

نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی!

جو بچے نے دیکھا مِرا پیچ و تاب
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب

رلاتی ہے تجھ کو جُدائی مِری
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چُپ رہا
دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا!

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے!

علّامہ اقبالؒ

مشق

۱۔ اس نظم کو سادہ نثر میں ایک کہانی کی صورت میں بیان کیجیے:
۲۔ چوتھے، پانچویں اور چھٹے شعر کا مطلب لکھیے:
۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے اور ان کے معنی بیان کیجیے۔
اضطراب، دہشت، محال، زمرد، پیچ و تاب، پسر، قطار
۴۔ اس نظم میں قافیوں کی ترتیب پر غور کرتے ہوئے بتائیے کہ شکل و صورت کے اعتبار سے اُسے کون سی صنف میں شمار کیا جا سکتا ہے؟

خواجہ الطاف حسین حالی

برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی قومی جدوجہد میں سرسید کی اصلاحی تحریک نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمان عام طور پر مایوسی کا شکار تھے۔ انہیں برِصغیر میں اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ ایسے حالات میں سرسید نے اصلاحی تحریک کا آغاز کرکے مسلمانوں کو ان کے زوال کے اسباب سے آگاہ کیا اور اپنی تحریر، تقریر اور عمل سے انہیں اس امر کی جانب متوجہ کیا کہ اگر وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو بھی بدلنے کی کوشش نہیں کریں گے تو ناممکن ہے کہ وہ دنیا میں ترقی کرسکیں، سرسید کی اس تحریک کو کامیاب بنانے میں ان کے رفقاء کی کوششوں کو بھی دخل ہے۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک، وقار الملک اور مولوی چراغ علی نے پورے خلوص سے سرسید کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیا۔ اس سلسلے میں خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی نظم و نثر کے ذریعے بیش بہا قومی خدمات انجام دیں، اور ایک ایسے ادب کی بنیاد رکھی جو بعد میں عظیم تر قومی مقاصد کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔

حالی ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ باپ کی طرف سے ان کا تعلق انصاری قبیلے کی اس شاخ سے تھا جو سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے سے پانی پت میں آباد چلی آتی تھی۔ حالی کے بزرگوں میں علم اور روحانیت کے اعتبار سے بڑی اہم شخصیتوں کے نام آتے ہیں جن میں ہرات کی مشہور روحانی شخصیت شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کا نام قابلِ ذکر ہے۔ حالی کے اجداد میں خواجہ ملک علی اپنے دور کے مروجہ علوم پر بڑی دسترس رکھتے تھے اور سلطان غیاث الدین بلبن کے دور میں ہرات چھوڑ کر پانی پت میں آباد ہو گئے تھے۔ پانی پت کا انصاریوں کا محلہ ان ہی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ حالی کی والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی بیٹی تھیں۔

حالی ابھی نو برس کے تھے کہ ان کے والد خواجہ ایزد بخش کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا بڑے بھائی بہنوں کے علاوہ اور کوئی سرپرستی کرنے والا نہ تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے حالی کو قرآن مجید حفظ کرایا۔ اگرچہ انہیں تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا لیکن اس کا معقول اور خاطر خواہ بندوبست نہ ہو سکا۔ اپنے طور پر انہوں نے فارسی کی دو چار کتابیں پڑھ لیں۔ پھر عربی صرف و نحو کی تعلیم حاصل کرلی۔ ابھی تعلیم کی بہت سی منزلیں طے کرنا باقی تھیں کہ بہن اور بھائی نے اصرار کرکے

ان کی شادی کرا دی۔ حالی کی عمر اس وقت سترہ برس کی تھی۔ شادی کے ساتھ ہی خاندان والوں کی طرف سے یہ تقاضا بھی ہوا کہ وہ کوئی نوکری کر لیں۔ اس لیے کہ اس وقت تک صرف بڑے بھائی کی تنخواہ پر ہی سارے گھر کا گزارہ تھا۔ چونکہ بیوی کا میکا آسودہ حال تھا، اس لیے حالی گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلے گئے۔ اور تقریباً ڈیڑھ برس تک مولوی نوازش علی سے جو مشہور واعظ اور مدرس تھے، عربی کی مختلف کتابیں پڑھتے رہے۔ آخر عزیزوں اور بزرگوں کے اصرار پر انہیں دلی چھوڑ کر پانی پت واپس آنا پڑا۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اسی اثنا میں بے پڑھی کتابوں کا اپنے طور پر مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار میں قلیل تنخواہ کی ایک اسامی پر ان کا تقرر ہو گیا، لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ ملازمت بھی جاتی رہی اور آپ پانی پت آ گئے۔ یہاں تقریباً چار برس بے کاری کی حالت میں گزرے۔ اس دوران میں پانی پت کے مختلف اساتذہ سے بغیر کسی ترتیب کے مختلف علوم کی تحصیل کرتے رہے۔ دلی میں قیام کے زمانے میں مرزا غالب کی خدمت میں اکثر و بیشتر حاضر ہوتے رہے۔ چونکہ شاعری سے طبیعت کو خاص مناسبت تھی اس لیے ایک آدھ غزل کہہ کر مرزا کو دکھائی۔ اس پر مرزا نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" یوں شاعری میں غالب اور حالی کے درمیان استادی اور شاگردی کا تعلق قائم ہو گیا۔

شعر و سخن میں حالی کے مذاق کے بنانے سنوارنے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت کو بھی بڑا دخل ہے۔ وہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے رئیس تھے اور اردو اور فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ حالی ان کے بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے سات آٹھ برس تک ان کے ساتھ جہانگیر آباد میں رہے۔ نواب صاحب کو شاعری میں مبالغہ سخت ناپسند تھا۔ وہ سیدھی سادی باتوں کو خوبصورت انداز میں بیان کرنے کو شاعری کا کمال سمجھتے تھے۔ شیفتہ کے ان خیالات کا حالی پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ بعد کی قومی نظموں میں ان کے ہاں حقیقت کا جو رنگ نمایاں نمایاں نظر آتا ہے وہ بھی کسی حد تک اسی کا نتیجہ ہے۔

شیفتہ کی وفات کے بعد حالی پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازم ہو گئے۔ یہاں انھیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنے کا کام سپرد ہوا۔ حالی تقریباً چار برس تک یہ خدمات انجام دیتے رہے۔ اس طرح انھیں انگریزی ادب سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا ہو گئی۔ اسی زمانے میں کرنل ہالرائڈ کی خواہش پر جو ان دنوں محکمۂ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر تھے مولانا محمد حسین آزاد نے ایک نئی طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں

مصرعِ طرح کی بجائے کوئی عنوان شاعروں کو دے دیا جاتا تھا کہ اس پر جس طرح چاہیں اپنے خیالات نظم میں ظاہر کریں۔ حالی نے اس مشاعرے کے لیے چار مثنویاں کہیں۔ ایک "برسات" پر، دوسری "امید" پر، تیسری "رحم و انصاف" پر اور چوتھی "حبِّ وطن" پر۔ یہ تمام مثنویاں ان کی نظموں کے مجموعے میں شامل ہیں۔

اس کے بعد حالی کا تبادلہ اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرّس کی حیثیت سے ہوگیا۔ یہیں سرسیّد نے انہیں ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی پستی اور زوال کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو اس سے قوم کو بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس پر عمل کرتے ہوئے حالی نے اپنا مشہور مسدّس کہا جو "مسدّس مدّوجزرِ اسلام" کے نام سے پڑھے لکھے اور بامذاق لوگوں میں عام طور سے مقبول ہے۔

اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرّسی ہی کے زمانے میں حیدر آباد (دکن) سے حالی کے لیے پچھتّر روپے ماہانہ کا امدادی وظیفہ مقرّر ہوگیا جو بعد میں سو روپے کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ملازمت سے قطع تعلق کر لیا اور بقیہ عمر پانی پت میں تصنیف و تالیف میں بسر کردی یہیں ۱۹۱۴ء میں حالی نے دنیائے فانی کو خیرباد کہا اور درگاہِ حضرت بو علی شاہ قلندر میں سپردِ خاک ہوئے۔

حالی کے دل میں قوم کا سچّا درد تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے سرسیّد کی آواز پر لبّیک کہا اور ان کی تحریک کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ وہ ہر اس کام میں پیش پیش رہے جس کا تعلق قوم کی فلاح و بہبود سے تھا۔ وہ اپنی نظموں میں مسلمانوں کی پستی، غلامی اور جہالت پر خون کے آنسو روتے ہیں اور ان کے شاندار ماضی کا ذکر کرکے ان میں فخر کا احساس بیدار کرتے ہیں۔ وہ ہر کہیں سوئے ہوؤں کو جھنجھوڑنے، جگانے اور جدوجہد پر اکسانے کے عمل میں مصروف نظر آتے ہیں۔ حالی بلاشبہ ہمارے ادب کی وہ پہلی شخصیت ہیں جن کے ہاتھوں ہماری باقاعدہ "قومی شاعری" کی بنا پڑی۔ اس اعتبار سے ان کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی

حالی کا شمار اُردو نثر کی ان پانچ شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے صحیح معنوں میں اردو کو علم اور فن کی زبان بنایا۔ حالی کے علاوہ اس سلسلے میں سرسیّد، محمد حسین آزاد، نذیر احمد اور شبلی کے نام یاد رکھنے کے لائق ہیں۔ حالی نے اُردو میں سوانح نگاری کی بنیاد رکھی اور یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی، اور حیاتِ جاوید کے ناموں سے مرزا غالب، شیخ سعدی اور سرسیّد احمد خاں کی سوانح عمریاں تحریر کیں۔ اس کے علاوہ "مقدمہ شعر و شاعری" میں انہوں نے نئی شاعری کے اصول سمجھائے۔ "مضامینِ حالی" کے نام سے ان کے قومی، مذہبی اور علمی مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ نظم میں دیوانِ حالی، مجموعہ نظمِ حالی اور "مسدّس مدّوجزرِ اسلام" ان کی یادگار تصانیف ہیں۔

راشد منہاس شہید نشانِ حیدر

تاریخ عالم میں ایسے واقعات بھی ہو گذرے ہیں کہ کچھ افراد نے قوم اور مُلک کی خاطر اپنی زندگیاں قربان کر دیں لیکن اپنے وطن کی سرحدوں پر آنچ نہ آنے دی۔ ایسے جری اور بہادر فرزند مُلک کا سرمایۂ افتخار ہوتے ہیں۔ اُن کی زندگی کا ایک ایک پل اپنے ملک کے لیے وقف ہوتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں جو مَیلی آنکھ سے اُن کے پیارے وطن کی طرف دیکھ سکے۔ یہ لوگ حق و باطل کے معرکوں میں فولاد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں شجاعت مردانگی اور جانبازی کی داستانیں رقم کر کے امر ہو جاتے ہیں۔ فضاؤں، سمندروں اور خشکیوں پر اُن کی عظمت کے ترانے گائے جاتے ہیں۔ ہمارے پیارے ملک پاکستان میں بھی ایسے جیالوں کی کمی نہیں جنھوں نے اپنے لہو میں نہا کر اپنے پرچم کو بلند رکھا اور ہمیں دنیا کی اقوام میں ایک ممتاز مقام عطا کیا۔ در اصل پاکستان کی کہانی انھی لوگوں سے عبارت ہے۔ ہم ہر سال ۶ ستمبر کے روز یوم دفاع مناتے ہیں اور اس دن وطن کی آن پر کٹ مرنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

اس سال بھی ۶ ستمبر کے دن تقریبات ہوئیں۔ شام کے وقت منصُور کے ابّا صحن میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں منصُور آ گیا اور اپنے ابّا سے پوچھنے لگا۔ "ابّا جان ذرا نشانِ حیدر کے بارے میں تو کچھ بتائیے۔"

"تمھاری بہن عندلیب بھی آ جائے تو پھر بتاؤں گا۔" اُس کے ابّا نے کہا۔ اتنے میں عندلیب بھی آ گئی اور دونوں اپنے ابّا کے پاس بیٹھ گئے۔

"نشانِ حیدر ہمارے ملک کا سب سے بڑا فوجی اعزاز ہے۔" ان کے ابّا نے کہنا شروع کیا۔ "اور یہ صرف اُن بہادروں کو دیا جاتا ہے جو دفاع پاکستان کے سلسلے میں کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیتے ہیں۔" "ابّا جان! اب تک کتنے لوگوں کو یہ نشان مِل چکا ہے۔" عندلیب نے پوچھا۔ "آٹھ فوجی افسروں کو۔" ابا جان نے جواب دیا۔

"منصُور میاں کیا تمھیں اپنے وطن کے ان جیالوں کے نام یاد ہیں۔" ابا جان نے منصُور سے پوچھا۔ "جی ہاں ایک دن ماسٹر صاحب نے ہمیں بتلائے تھے، ٹھہریے، میں بتاتا ہوں۔ کیپٹن سرور شہید، میجر محمد طفیل شہید، میجر عزیز بھٹی شہید، سوار محمد حسین شہید، پائلٹ افسر

راشد منہاس شہید ــــ منصور فرفر سنانے لگا۔

"یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری آزادی کے محافظ ہیں۔ ہمارے ملک کا سکھ چین انہی کے دم قدم سے ہے۔ جب ہم سو رہے ہوتے ہیں تو یہ سرحد پر ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتے ہیں۔" اُن کے ابا کہہ رہے تھے۔ "میں بھی بڑا ہو کر فوجی افسر بنوں گا اور دشمن کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑا ہو جاؤں گا۔" منصور نے فرطِ جذبات سے کہا، اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ابھی دشمن کی صفوں پر عقاب کی طرح جھپٹ پڑے گا۔ ابا جان اُس کے ارادوں کو دیکھ کر نہایت مسرور ہو رہے تھے اور اُس سے کہنے لگے فوج میں جانے کے لیے اعلیٰ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صلاحیتیں سخت محنت اور نظم و ضبط سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ تعلیم کو فرض سمجھ کر حاصل کرو۔

"ابا جان ہمیں کسی شہید کی کہانی سنایئے نا۔" عندلیب نے مطالبہ کیا۔ "اچھا بھئی آج ہم تمہیں راشد منہاس شہید کا واقعہ سناتے ہیں۔" اُنھوں نے کہنا شروع کیا۔ "راشد منہاس شہید کی کہانی وطن کی فضاؤں میں خود اُن کے لہو سے لکھی گئی ہے۔ یہ اگست ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ برسات کے بھیگے ہوئے دن تھے۔ پائلٹ افسر راشد منہاس شہید حسبِ معمول اپنے جیٹ جہاز میں داخل ہوئے۔ اتنے میں ایک تربیت دینے والا اسی جہاز کے کاک پٹ میں داخل ہوا۔ راشد منہاس نے سمجھا کہ شاید وہ جہاز کے کل پرزوں کی دیکھ بھال کے لیے آیا ہے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے جہاز چلا دیا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ اُس نے جہاز کا رُخ ہندوستان کی طرف پھیر دیا۔ تب راشد منہاس کو محسوس ہوا کہ دراصل وہ تربیت دینے والے کے بھیس میں کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہے اور جہاز کو اغوا کر کے ہندوستان لے جانا چاہتا ہے۔ راشد منہاس نے پوری کوشش کی کہ طیارے کا رُخ موڑ سکیں لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اب ہندوستان کی سرحد صرف پینسٹھ کلومیٹر دُور رہ گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے جان کی بازی لگانے کا تہیہ کر لیا اور یہ ٹھان لیا کہ خواہ جان جائے یا رہے جہاز کو دشمن کی سرحد میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔" عندلیب اور منصور دونوں محویت سے اس سرفروشانہ کارنامے کی تفصیلات سُن رہے تھے اور ابا جان انہیں ایک خاص جذبے سے سُنا رہے تھے۔

"اور پھر یوں ہُوا کہ انھوں نے اُس غیر ملکی ایجنٹ سے طیارے کا کنٹرول حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اب ہندوستان کی سرحد صرف بتّیس کلومیٹر دُور تھی۔ دفعتہً جہاز کا رُخ زمین کی طرف ہو گیا۔ آن کی آن میں جہاز ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ زمین سے جا ٹکرایا اور شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔



راشد منہاس شہید

راشد منہاس نے وطن کے غدار کو جہنم واصل کر دیا اور خود شہادت کے بلند مرتبے پر فائز ہو گئے۔"

جب ابّا جان نے بہادری کا یہ واقعہ ختم کیا تو عندلیب اور منصور کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ ایسی چمک جو دشمنوں پر قہرِ الٰہی بن کر نازل ہوتی ہے۔

مشق

۱۔ یومِ دفاع کس تاریخ کو منایا جاتا ہے؟

۲۔ پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز کون سا ہے؟

۳۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

۵ جان کی بازی لگا دینا۔ تہیہ۔ مسرور۔ آسمان سے باتیں کرنا۔ فائز۔ محویت۔

۴۔ اُس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں۔ ہمیں کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ چور کپڑا لتّا لے کر بھاگ گئے۔ کیا آپ کھانا وانا نہیں کھائیں گے۔ کہیں سے روٹی ووٹی مل گئی تو کھا لیں گے۔

مندرجہ بالا جملوں میں روپیہ پیسہ، بھاگ دوڑ، کپڑا لتّا، کھانا وانا، روٹی ووٹی جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پہلے لفظ کو متبوع اور دُوسرے کو تابع کہا جاتا ہے۔ مثلاً بھاگ دوڑ میں بھاگ متبوع اور دوڑ تابع ہے۔ دوڑ، پیسہ، لتّا بامعنی الفاظ ہیں، اس لیے انھیں تابع موضوع کہا جاتا ہے مگر وانا، ووٹی بے معنی ہیں اس لیے یہ تابع مہمل کہلاتے ہیں۔

اِذنِ جہاد

رسولِ اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت تاریخ اسلام میں ایک نہایت ہی اہم موڑ ثابت ہوئی۔ کفارِ مکہ کے ظلم وستم سے ستائے ہوئے مسلمان جب مدینہ پہنچے تو انہیں یہاں احکامِ دین پر آزادی کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اِسلام کی اشاعت کا اہتمام ہُوا۔ لوگ جوق در جوق رسولِ خداؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو ہو کر دینِ حق کو قبول کرنے لگے۔ اس سرزمین پر پہلی بار اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا جس کی بنیاد باہمی بھائی چارے اور محبت پر رکھی گئی۔ یہاں امن، آشتی اور انصاف کا دور دورہ تھا اور انسان قتل وغارت، مکر وفریب، کینہ پروری اور جھوٹے خداؤں کے طلسم سے نجات حاصل کر چکا تھا۔ اس ریاست میں کالے گورے اور آقا وغلام کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ عزت کا معیار خدا کا خوف اور اس کے رسولؐ کی اطاعت تھی۔ کفارِ مکہ کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ یہاں بھی مسلمانوں کو چین سے نہیں رہنے دیں گے اور مدینے پر حملہ آور ہو کر اس کے در و دیوار کو مسلمانوں کے خون سے رنگین کر دیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ابتدائی طور پر مختلف حربے آزمائے۔ پہلے پہل انہوں نے اپنے آدمی بھیج کر مدینے کے گرد ونواح میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ جہاں کہیں کوئی مسلمان تنہا نظر آیا، اسے بے دریغ قتل کر دیا۔ رسولِ خداؐ یہ سب کچھ دیکھتے تھے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ابھی خدا کی جانب سے جہاد کا حکم نہیں پہنچا تھا۔ جب قریش کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو اللہ کی جانب سے جبریلِ امین جہاد کا حکم لے کر آ پہنچے۔ اس کی کیفیت آپ حضرت حفیظ جالندھری کی زبان سے سنیے:۔

بالآخر وقت آیا رحمتِ حق جوش میں آئی
کہ اذنِ جنگ بن کر غیرتِ حق جوش میں آئی
معاً جبریلؑ لے کے آیۂ قرآں ہوئے داخل
جہاد فی سبیل اللہ کے فرماں ہوئے نازل
یہ حکم آیا کہ "ہاں اب ان غریبوں کو اجازت ہے
بچارے بے وطن آفت نصیبوں کو اجازت ہے
وہ جن پر ظلم کے بیداد کے بادل برستے ہیں
وہ جو اپنے وطن میں سانس لینے کو ترستے ہیں
جو ناحق کے ستم سہتے ہیں اور مغموم رہتے ہیں
وطن کو چھوڑ کر بھی بے کس و مظلوم رہتے ہیں
خطا جن کی فقط یہ ہے کہ وہ اسلام لے آئے
جو دنیا کو لٹا کر اِک خدا کا نام لے آئے
جنہیں دشمن تہیہ کر چکے ہیں تنگ کرنے کا
ہے ان کو اذنِ حملہ آوروں سے جنگ کرنے کا
خدا ظالم کے منصوبوں کو رد کرنے پہ قادر ہے
خدا مظلوم لوگوں کی مدد کرنے پہ قادر ہے
نہ دے اللہ اگر حملوں کے سدِ باب کی جرأت
یونہی بڑھتی رہے ہر ایک شیخ و شاب کی جرأت

یہ معبد، خانقاہیں، صومعے یکسر اجڑ جائیں — منادر اور گرجے بیخ سے بن سے اکھڑ جائیں
مساجد، جن کے اندر ذکرِ حق کثرت سے ہوتا ہے — جہاں انسان آکر معصیت کے داغ دھوتا ہے
گرا دیں لوگ آکر ان عماراتِ مقدس کو — نہیں منظور یہ اللہ کی ذاتِ مقدس کو
رسول اللہ نے اِک دن بصد تاکید و پابندی — سنایا اہلِ ایمان کو یہ فرمانِ خداوندی
کہا "راہِ خدا میں تم کو لڑنے کی اجازت ہے — خدا کے دشمنوں کو دفع کرنے کی اجازت ہے
مگر، تم یاد رکھو صاف ہے یہ حکم قرآں کا — ستانا بے گناہوں کو نہیں شیوہ مسلماں کا
نہیں دیتا اجازت پیش دستی کی خدا ہرگز — مسلماں ہو تو لڑنے کی نہ کرنا ابتدا ہرگز
فقط اُن سے لڑو جو لوگ، تم سے جنگ کرتے ہیں
فقط اُن سے لڑو جو تم پہ جینا تنگ کرتے ہیں" (حفیظ جالندھری)

مشق

۱۔ جملہ اسمیہ کے ذیل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس میں مبتداء اور خبر دونوں اسم ہوتے ہیں اس کے برخلاف جملہ فعلیہ میں خبر اسم کی بجائے کوئی فعل ہوتا ہے۔ یہاں فعلِ ناقص کی بجائے ایسے افعال کا استعمال ہوتا ہے جنھیں اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لیے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے جملے فعل، فاعل اور بعض اوقات فعل، فاعل اور مفعول سے بنتے ہیں۔ مثلاً "زید آیا"۔ اس جملے میں زید فاعل ہے اور آیا فعل۔ یا مثلاً "حامد نے غصے میں گلاس توڑ دیا۔ یہاں حامد فاعل، گلاس مفعول اور توڑ دیا فعل ہے۔ اس طرح کے جملوں کی ترکیبِ نحوی حسب ذیل طریقہ سے ہوگی۔

"میں نے سبق پڑھا" [پڑھا ۔ فعل، میں ۔ فاعل، نے ۔ علامتِ فعل، سبق ۔ مفعول] جملہ فعلیہ

آج کے سبق میں سے پانچ فعلیہ جملے چھانٹ کر ان کی ترکیبِ نحوی کیجیے۔

۲۔ اسلام میں جہاد کیوں کر ضروری ہے؟

۳۔ مسلمانوں کو کن حالات میں جہاد پر کمربستہ ہونے کا حکم ہے؟

۴۔ درجِ ذیل الفاظ پر اعراب لگائیے اور ان کے معنی بیان کیجیے۔

بالآخر، فی سبیل اللہ، معبد، صومعہ، منادر، معصیت، بیخ، بن۔

۵۔ آج جس نظم پارے کا آپ نے مطالعہ کیا ہے وہ "شاہنامہ اسلام" سے لیا گیا ہے جس کے مصنف ہمارے بزرگ شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری ہیں۔ اس کتاب میں حفیظ صاحب نے تاریخِ اسلام کے ایک دور کی تفصیلات نظم میں بیان کی ہیں۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ اسے حاصل کر کے اس کے آسان آسان سے حصے ضرور پڑھیے اور اپنے بزرگوں کے کارناموں پر غور کیجیے۔

حافظ کفایت حسین

پاکستان میں ایسے علماء بھی ہو گذرے ہیں جنھوں نے یک جہتی اور اتحاد کو فروغ دینے کے لیے اپنی عمر کا بیشتر حصہ وقف کر دیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ وطنِ عزیز میں بسنے والے تمام طبقوں میں ہم آہنگی ہو تاکہ ہم قدم بہ قدم آگے بڑھیں اور دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکیں۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے علماء نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ پاکستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور لوگوں کو اتحاد و اتفاق کا درس دیا۔ انھی علماء میں حافظ کفایت حسین بھی شامل تھے، جنھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے ملک کے کونے کونے میں اخوت اور رواداری کا رنگ بھرا۔

حافظ کفایت حسین ۱۸۹۸ء میں ضلع بلند شہر کے مشہور قصبہ شکار پور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مولانا ماہر محمد غوث سے حاصل کی اور مولانا غلام حسین سے قرآن حفظ کیا جب آپ بارہ سال کے ہوئے تو مزید تعلیم کی خاطر مدرسۂ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ تعلیم کے دوران محنت اور ذہانت کی وجہ سے آپ دوسرے طلباء میں ہمیشہ ممتاز حیثیت کے حامل رہے، چنانچہ پنجاب یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے مشرقی علوم کے اعلیٰ امتحانات امتیاز سے پاس کیے۔ اور ممتاز الافاضل ہونے کے بعد آپ نے ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ شروع کیا۔

یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے جب سرحدی علاقوں کے لوگوں نے انگریزوں کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور مطالبہ کیا کہ ہمارے مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق کیے جائیں۔ چنانچہ حکومت کو قبائلیوں کے اس مطالبے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور آپ کو قبائلی علاقے میں قاضیٔ شریعت مقرر کیا گیا۔ آپ نے اُن کے مقدمات کے فیصلے اِس خوش اسلوبی سے کیے کہ ہر طرف آپ کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ آپ نے چھ مہینے کے اندر اندر پشتو زبان سیکھ کر درس و تدریس کا آغاز کر دیا۔ اب کیا تھا ہر طرف ایک مذہبی فضا قائم ہو گئی اور علاقے کا بچّہ بچّہ آپ پر جان چھڑکنے لگا۔ حکومت کو علامہ مرحوم کی ہر دلعزیزی ایک آنکھ نہ بھائی۔

چنانچہ انھیں اس منصب سے ہٹانے کے لیے چالیں سوچی جانے لگیں۔ اتفاق کی بات

ہے کہ کسی نامعلوم شخص نے پولیٹیکل ایجنٹ کی کوٹھی میں بم رکھ دیا۔ وہ خود تو بچ گیا لیکن حافظ صاحب اس شبہ کا شکار ہو گئے۔ انھی دنوں آپ پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا لیکن آپ بال بال بچ گئے۔ چنانچہ آپ نے اِس عہدے سے استعفا دے دیا اور تبلیغِ دین میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

رام پور کے نواب نے جب تفسیرِ قرآن لکھنے کے لیے ایک بورڈ کی تشکیل کی تو اس میں علامہ حافظ کفایت حسین کو بھی شامل کیا گیا۔ چنانچہ آپ قیامِ پاکستان تک اِس اہم فریضہ کی تکمیل میں مصروف رہے۔ اِسی اثناء میں پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ نواب رام پور نے بہتیری کوشش کی کہ آپ کسی طرح بھارت ہی میں رُک جائیں۔ مگر آپ نے پاکستان آنے کو مقدّم سمجھا اور لاہور چلے آئے۔

پاکستان آکر آپ اسلامیانِ پاکستان کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور شہر شہر جاکر اِتحاد بین المسلمین کی خاطر شبانہ روز کام شروع کر دیا۔ چنانچہ جب حکومت نے ۱۹۵۷ء میں لاء کمیشن قائم کیا تو حافظ صاحب کو اِس کا ممبر مقرر کیا گیا۔ اِس کمیشن کا مقصد تھا کہ ملک میں اِسلامی قوانین کا نفاذ کیا جائے۔ جسٹس شریف جو اِس کمیشن کے سربراہ تھے، کہتے ہیں کہ دین کی جیسی جامع تعریف حافظ صاحب نے کی میں نے اِس سے پہلے کہیں نہیں سُنی۔ اس کے بعد آپ کو اوقاف بورڈ اور اسلامی مشاورتی کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ علم و فضل کے اعتبار سے حافظ صاحب یگانۂ روزگار تھے۔ باریک سے باریک نکتے کو اس عمدگی سے پیش کرتے کہ عالم اور جاہل یکساں طور پر مستفید ہوتے۔ خطابت میں شعلہ بیانی یا تقریر میں گُل فشانی نہ تھی، علمی بیان، سادہ زبان اور ہر دلیل میں قرآن۔ اس کا اثر یہ تھا کہ سامعین تڑپ اُٹھتے۔ ان کی تقریر کا پس منظر علم و فکر سے عبارت تھا۔ خوبی یہ تھی کہ سائنس، فلسفہ، کلام اور منطق کے آب و گِل سے تیار شدہ ڈھانچہ عوام و خواص کے لیے باعثِ کشش تھا۔

حافظ صاحب نہایت سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ لباس سادہ پہنتے۔ نشست و برخاست میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔ دراصل یہی سادگی اُن کی اخلاقی بلندی کی ترجمان اور اُن کے فقیرانہ مزاج کی آئینہ دار تھی۔ اس پس منظر میں اُن کی شخصیت کے خد و خال بنتے اور انفرادیت اُبھرتی تھی۔ ہر ایک سے یکساں طور پر ملنا اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگ ہمیشہ بلندی پر رہتے، انکسار اور فروتنی کی بجائے خود پسندی کا شکار ہوتے ہیں۔ لوگوں سے میل جول میں اپنی بڑائی کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی رفتار میں ٹھہراؤ، لہجے میں تمکنت اور نشست میں ایک شان ہوتی ہے۔ مگر حافظ صاحب اِن میں سے کسی چیز کے پابند نہ تھے۔ وہ چھوٹے بڑے

موافق، مخالف، دوست دشمن ہر ایک سے جھک کر ملتے۔ اپنے بیگانے کے کام کرتے اور بلا امتیاز ہر ایک کی ضرورت پوری کرتے تھے۔

انسانی برادری کو آج جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ رواداری اور محبّت ہے اور اسلام کا پیغام بھی یہی ہے۔ اسلام نے قوم اور نسل کے امتیازات مٹانے کی تعلیم دی ہے۔ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے حافظ صاحب نے اپنی تمام عمر رواداری اور محبّت کے اسلامی پیغام کی اشاعت میں صرف کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طبقے میں مقبول تھے۔

تعلیم یافتہ طبقہ حافظ صاحب کا بے حد گرویدہ تھا کیونکہ وہ اِلٰہیات سے متعلق نہایت دقیق مسائل جدید علوم کی روشنی میں اُن کے سامنے پیش کرتے اور ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ اِس عنوان سے کرتے تھے کہ پھر اُن کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے ایمان کی شمعیں روشن ہو جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ تعلیم یافتہ اُن کی مجالس میں جوق در جوق شرکت کرتے تھے اور دامنِ مراد بھر کر اُٹھتے تھے۔

مگر آسمانِ علم و عمل کا یہ آفتابِ درخشاں ۴ اپریل ۱۹۶۸ء کی رات کو ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

مشق

۱ ۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے علماء نے کیا کردار ادا کیا؟
۲ ۔ انسانی برادری کو سب سے زیادہ کِس چیز کی ضرورت ہے؟
۳ ۔ انسان کا بہترین اخلاق کیا ہونا چاہیے؟
۴ ۔ آفتابِ درخشاں، اتحاد و اتفاق، یگانۂ روزگار کون سے مرکبات ہیں؟
۵ ۔ معنی لکھیے۔ جوق در جوق، ہم آہنگی، ہمہ تن مصروف، تکمیل، بٹوارہ، مقدّم، تمکنت، اشاعت،

۶ ۔ خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پُر کیجیے۔
ا۔ طلبہ شہر کے کونے ـــــ میں پھیل گئے۔
ب۔ ہر طرف آپ کے نام کا ڈنکا ـــــ لگا۔
ج۔ اسلام نے قوم اور نسل کا امتیاز ـــــ کی تعلیم دی ہے۔
د۔ ـــــ بڑے، موافق، مخالف ہر ایک سے یکساں طور پر ملتے۔

اِسلامی مُلکوں کے سربراہ لاہور میں

فروری کے مہینے کی ۲۲ تاریخ ہے۔ صبح کے ۹ بجے ہیں۔ لاہور کی شاہراہِ قائدِ اعظم کی طرف لوگ اُمڈے چلے آرہے ہیں۔ مرد، عورتیں، جوان، بچے، بوڑھے شاہراہ پر پہنچتے ہی دو رویہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سڑک پر فوجی جوان نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ساڑھے دس بجے تک تو سڑک کی دو رویہ قطاروں میں آدمیوں کا بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ قطاروں میں کھڑے آدمیوں کو گھٹن محسوس ہونے لگی ہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا ہے۔ دو گھنٹوں سے کھڑے ہونے والوں کی ٹانگیں کھڑے کھڑے تھک چکی ہیں۔ لیکن وہ نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب یکایک فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اُٹھتی ہے۔ لاکھوں انسانوں کے اِس سمندر میں کچھ دیر کے لیے ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ سڑک پر سے موٹر سائیکلوں پر سوار حفاظتی دستہ گزر رہا ہے اور اِس کے پیچھے اسلام کے وہ نامور فرزند آرہے ہیں جن کو ایک نظر دیکھنے کے لیے لاکھوں انسانوں کا یہ ہجوم گھنٹوں سے کھڑا ہے۔ جن قابلِ احترام مہمانوں کے لیے لاہور کے تاریخی شہر کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ اِسلامی ملکوں کے یہ سربراہ جب قطاروں کے سامنے سے گذرتے ہیں، تو لوگ تالیاں بجا بجا کر اور نعرہ ہائے تکبیر بلند کر کے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ دیکھیے قطاروں کے سامنے سے نہایت عزّت و وقار کے ساتھ ایک ہستی گزر رہی ہے۔ لوگ دیکھ کر زور شور سے نعرے لگا رہے ہیں۔ یہ صرف ہاتھ ہلاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ یہ درویش منش بادشاہ اور اسلام کے عاشقِ زار سعودی عرب کے فرماں روا شاہ فیصل ہیں جو دُنیائے اِسلام کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ اب پھر نعروں میں شدّت پیدا ہو چکی ہے۔ ہاں۔ یہ تو بے ملک و بے تاج بادشاہ، الفتح کے سربراہ یاسر عرفات ہیں، جو نعروں کے جواب میں انگلیوں سے 'وی' کا نشان بنائے ہوئے گذرتے جا رہے ہیں۔ یہ یوگنڈا کے حکمران عیدی امین ہیں۔ ان کے بھاری بھرکم جسم پر فوجی وردی خُوب سج رہی ہے، لوگوں کے نعروں کا جواب جوش و خروش سے ہاتھ ہلا ہلا کر دیتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ یک بارگی تذاقی، تذاقی کا شور بلند ہوتا ہے۔ لوگ نظم و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے ہیں۔ انھیں دیکھنے کے لیے بندھی ہوئی قطاریں درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ فوجی نوجوانوں کو دوبارہ نظم و ضبط برقرار رکھنے میں بڑی مشکل پیش آرہی ہے۔ دیدہ زیب، گہرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس، اسلام کے شیدائی تذافی اپنے علامتی نشان سے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو باہم پیوست

کرکے لوگوں کی محبت اور عقیدت کا جوش و خروش سے جواب دے رہے ہیں۔ اسلامی سربراہوں کا یہ قافلہ لاہور کی شاہی مسجد میں نماز ادا کرنے جا رہا ہے۔ اسلامی ملکوں کے یہ سربراہ اسلامی سربراہ کانفرنس میں شرکت کے لیے فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور آئے تھے۔

اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے رنگ و نسل، قوم و وطن اور زبان کے امتیازات ختم کرکے ایک عالمگیر انسانی برادری کی بنیاد ڈالی۔ افریقہ کا ایک حبشی اسلام قبول کرنے کے بعد عرب کے عالی نسب قریشی کا بھائی بن جاتا ہے۔ جاپان کے ایک مسلمان کا مراکش کے ایک مسلمان سے بھائی چارے کا رشتہ قائم ہے۔ اگرچہ ان کے درمیان رنگ و نسل، وطن اور زبان کا بڑا فرق موجود ہے، لیکن اسلام نے ان میں وحدتِ فکر اور پھر وحدتِ عمل پیدا کرکے ایک دوسرے کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔ اسلام نے نسلی اور لسانی غرور کو مٹا کر احترام آدمی کا سبق دیا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام اپنے آغاز کے ساتھ ہی بڑی قوت بن کر اُبھرا اور صدیوں تک وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا رہا۔ اسلامی اصولوں کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کے بعد مسلمان سلطنتیں سولھویں صدی سے کمزور ہونے لگیں۔ کئی اسلامی سلطنتیں مٹ گئیں۔ افریقہ و ایشیا میں بہت سے ملکوں کے مسلمان یورپین اقوام کے غلام بن گئے۔ جو تھوڑی بہت مسلمان سلطنتیں بچ گئیں، وہاں بھی اسلام کے قائم کیے ہوئے معاشرے کی دیواریں ہلنے لگیں۔ انیسویں صدی تک تمام دنیا کے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ ان کے علماء اور ان کے دانشور مسلمانوں کی اس حالت پر خون کے آنسو روتے رہے۔

آخر افغانستان کی سر زمین سے ایک شخصیت اُٹھی۔ یہ سید جمال الدین افغانی تھے۔ اُنھوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو پکارا اور کہا کہ "مسلمانو! افغانی، ایرانی اور ترکی مت بنو۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ عالمی اسلامی بھائی چارے کا قائل ہے۔ اگر اس دنیا میں عزت کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اتحادِ اسلامی کی طرف آؤ۔" سید صاحب کے دل سے نکلی ہوئی آواز دنیا کے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں اتر گئی۔ جب ہر طرف سے ان کی آواز کی بازگشت سنائی دینے لگی تو وہ یورپین قومیں جو مسلمانوں کو غلام بنائے ہوئے تھیں وہ چوکنا ہو گئیں۔ خصوصاً انگریز قوم کو جس نے ایشیا اور افریقہ کے کئی مسلمان ملکوں پر قبضہ کرکے وہاں کے مسلمانوں کو غلام بنا رکھا تھا، اپنا اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا۔ اس لیے وہ سید جمال الدین افغانی کے پیچھے پڑ گئی۔ حتیٰ کہ اُس کی سازشوں کی وجہ سے سید صاحب کو ترکی، مصر جیسے اسلامی ملکوں میں بھی پناہ نہ مل سکی۔ لیکن وہ جہاں بھی جاتے، ایران، مصر
... کر جاتے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے اسلامی اتحاد
مسلمانوں میں بیداری پیدا

کے کام کو آگے بڑھایا۔

سیّد صاحب کے بعد ہندوستان کی سرزمین سے ایک درد و سوز میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

"ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر"
"جو کرے گا امتیازِ رنگ وخوں مٹ جائے گا — ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر"

یہ آواز شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؔ کی تھی، جس نے نہ صرف ہندی مسلمان کو گہری نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دیا، بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں میں اتحادِ عالمِ اسلام کے جذبات کروٹیں لینے لگے۔ ان کی شاعری اسلامی دنیا کے لیے ایک ایسا زندگی بخش پیغام ہے جسے اپنا کر مسلمان دوبارہ دنیا کی ایک بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نہ صرف مصورِ پاکستان ہی ہیں بلکہ ان کی شاعری نے عالمی اسلامی اتحاد کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ آپ کو کبھی لاہور جانے کا اتفاق ہو تو ان کے مزار پر ضرور حاضری دیجیے۔ اتحادِ عالمِ اسلام کے موجودہ دَور کے سب سے بڑے داعی کی لوحِ مزار پر ان کی ایک یہ فارسی رباعی کندہ ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — مسلمانیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو برما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

اِس رباعی کا مطلب یہ ہے کہ ہم مسلمان اور صرف مسلمان ہیں۔ ہم ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں۔ ہم افغان، ترک اور تاتاری نہیں۔ ہم پر نسل پرستی حرام ہے۔ ہم اسلامی نوبہار کے پروردہ ہیں۔ ہم اسلامی عالمی برادری کے قائل ہیں۔ ان کی لوحِ مزار کی اس رباعی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اتحادِ اسلامی کے کتنے بڑے علم بردار تھے۔ ان کے کلام نے تمام دنیا کے مسلمانوں اور خصوصًا برِّصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں اتحادِ عالمِ اسلام کی شدید تڑپ پیدا کردی۔

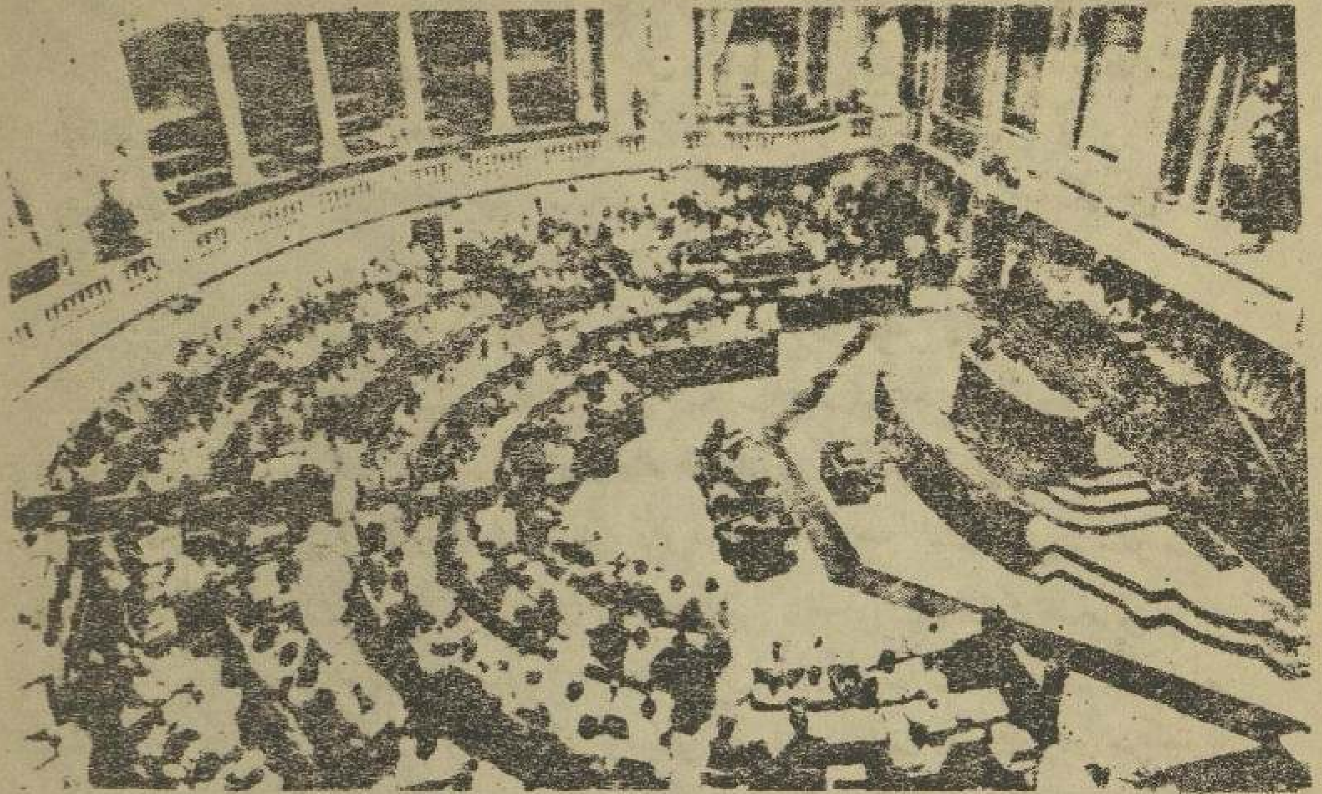
جہاں تک برِّصغیر کے مسلمانوں اور اتحادِ عالمِ اسلام کا ذکر ہے وہ اپنے دورِ غلامی میں بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے بڑی اپنائیت محسوس کرتے تھے جب بھی کسی اسلامی ملک پر کوئی مصیبت آئی برِّصغیر کے مسلمان نے اس کی مصیبت کو اپنی مصیبت جانا۔ درحقیقت پاکستان کا حصول بھی عالمی اسلامی اتحاد کے لیے ضروری سمجھا گیا۔ پاکستان بننے سے صرف ایک سال پہلے حضرت قائدِاعظم نے حیدرآباد دکن کے ایک جلسہ عام میں حصولِ پاکستان کی جدّ وجہد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا: "اِس وقت میدانِ سیاست میں ہندوؤں مسلمانوں کی جنگ جاری ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں، کون فتح یاب ہوگا، علمِ غیب خدا کو ہے، لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علی الاعلان کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن شریف کو اپنا

آخری اور قطعی رہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر کاربند ہوں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی ایک طاقت یا کئی طاقتیں مل کر بھی مغلوب نہیں کر سکتیں۔ ہم تعداد میں کم ہونے کے باوجود فتح یاب ہوں گے اور اسی طرح فتح یاب ہوں گے جس طرح مٹھی بھر مسلمانوں نے ایران و روم کی سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیئے تھے۔"

پاکستان بننے کے بعد اسلامی ملکوں کے بارے میں پاکستان پر جو فرض عاید ہوتا تھا اس نے وہ پورا کیا۔ دنیا کی بڑی طاقتوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ اسلامی ملکوں میں اتحاد قائم نہ ہو سکے لیکن ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ نے عربوں اور تمام مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ غیر مسلم طاقتیں کبھی مسلمانوں کی خیر خواہ نہیں ہو سکتیں۔ عرب اسرائیل کی اس جنگ کے نتیجے اور بڑی طاقتوں کی مسلم کش پالیسی نے دنیا کے مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا کہ اگر انہوں نے عزت کے ساتھ اس دنیا میں زندہ رہنا ہے تو صرف اتحادِ عالمِ اسلام ہی کے ذریعے یہ عزت کی زندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس جنگ سے پہلے بھی مراکش کے شہر رباط میں اسلامی حکومتوں کے سربراہ سر جوڑ کر بیٹھے تھے تاکہ اتحادِ عالمِ اسلام کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا جا سکے مگر عرب اسرائیل جنگ کے بعد تو اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اتحادِ عالمِ اسلام کی کوششوں کو تیز تر کیا جائے۔

دُوسری مرتبہ پاکستان کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ فروری ۱۹۷۴ء میں وہ دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس کا میزبان بنا۔ چنانچہ داتا گنج بخش اور علامہ اقبالؒ کے لاہور میں بڑی شان و شوکت سے دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں بتیس تینتیس اسلامی ملکوں کے سربراہوں نے بذاتِ خود یا ان کے نمائندوں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں عالمِ اسلام کے اتحاد کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے کئی تجویزیں منظور کی گئیں۔ اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو ایک نظر دیکھنے کے لیے پاکستان کے کونے کونے سے لوگ لاہور پہنچے، اور جیسا کہ ہم اس سبق کے شروع میں ذکر کر چکے ہیں، ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لاکھوں انسانوں کو گھنٹوں کھڑا رہنا پڑا اور وہ ذوق و شوق کے عالم میں کھڑے رہے تاکہ وہ ان ہستیوں کو دیکھ سکیں جو اسلام کی سربلندی کے لیے لاہور کے تاریخی شہر میں صلاح و مشورہ کے لیے اکٹھی ہوئی ہیں۔ قائدِاعظم نے ایک موقع پر کیا خوب فرمایا تھا۔

"وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس



امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، ایک امت۔"

"حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک"

مشق

۱۔ دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس کب اور کہاں ہوئی؟
۲۔ اتحادِ عالمِ اسلام کے دو بڑے داعیوں کے نام بتلائیے؟
۳۔ مسلمانوں کے لیے اتحادِ عالمِ اسلام کیوں ضروری ہے؟
۴۔ پاکستان نے اتحادِ عالمِ اسلام کے لیے کیا کیا کام کیے؟
۵۔ شاہ فیصل شہید، یاسر عرفات، قذافی اور عیدی امین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
۶۔ علامہ اقبال کی لوحِ مزار پر ان کی جو رباعی کندہ ہے اس کا مطلب بیان کیجیے۔
۷۔ "جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا ؛ ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر"
علامہ اقبالؒ کے اِس شعر کا مطلب بیان کیجیے۔

شہزادی برجیس کی کہانی

جب گولیوں کی باڑھ اور پھانسیوں کی قطار کا زور ہو رہا تھا تو گھر میں صرف ہم دو میاں بیوی ہی تھے اور کوئی اتنا نہ تھا کہ دوائی ٹھنڈائی تو درکنار، دو گھونٹ پانی ہی لا دے۔ پکڑا دھکڑی کا یہ عالم کہ جو باہر نکلا پھر نہ پلٹا۔ صبح کو گیا تو، دوپہر کو نکلا تو، شام کو پھانسی کی خبر آ گئی۔ ہماری گلی میں کھاری پانی کا کنواں تھا۔ رات کو میں چپکے سے جاتی اور دو لوٹے بھر لاتی۔ خدا بھلا کرے، بیچارے احمد عطار کا اس نے مجھ کو خاکسیر اور عناب کے شربت کی ایک بوتل دے دی تھی۔ دونوں وقت بیمار کو وہی پلا دیتی، دوسرے تیسرے وقت خالہ کبری کچھ چنے دے دیتیں، وہی کھا کر پانی پی لیتی۔ مہینہ سوا مہینہ اسی طرح کیا مگر ننھے دولھا کا بخار نہ اترا۔ صبح کو ہلکا ہو جاتا مگر دوپہر سے پہلے اور چڑھتا۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں مزاج ایسا چڑچڑا ہو گیا تھا کہ بات بات پر بگڑتے تھے۔ میرا محلہ خانم کے بازار سے ملا ہوا تھا اور ابھی تک اللہ کا فضل تھا کہ حکیم باقر کے داماد نے ایک دن کسی گورے کی ٹوپی اچھالی اور اس کی میم کو لیا۔ اب کیا تھا شام تک چاروں طرف گورے ہی گورے تھے۔ گھروں میں گھس گھس کر مردوں کو پکڑا اور مارا۔ آدھی رات کو جا کر امی جمی ہوئی۔ میں کنڈی لگائے جانماز پر اللہ اللہ کر رہی تھی۔ پچھلا پہر ہو گا کہ خالہ کبری نے آواز دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آئیں اور کہا، "جس طرح ہو، یہاں سے بھاگو۔ صبح کو سارا محلہ توپ سے اڑے گا۔" میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور کہا "بھلا خالہ میں کس طرح بھاگ سکتی ہوں۔ ننھے دولھا کو کیوں کر ساتھ لوں۔ یہ نہ چل سکتے ہیں نہ اٹھ سکتے ہیں۔ ان میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہڈیاں ہی رہ گئی ہیں۔" وہ بولیں "دیر کا موقع نہیں۔ جس طرح ہو اٹھاؤ سب پکڑ کر لے چلیں گے۔" میں تو جانوں تین بجے ہوں گے کہ ہم سب بھرا گھر چھوڑ چھاڑ شہر سے نکلے۔ بیمار کو ڈنڈا ڈولی کیا اور ایک طرف کو چلے۔ صبح ہم کو نظام الدین[1] میں ہوئی مگر آگے بڑھ گئے۔ دن بھر کیا گذرا، رستہ کس طرح کٹا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کھیل کا دانہ بھی اڑ کر منہ میں نہ گیا۔ پیاس کے مارے جان نکلی جاتی تھی مگر پانی کا پتہ نہ تھا۔ کنوئیں تھے مگر رسی تھی نہ ڈول۔ شام کو خواجہ صاحب کے قریب ہم کاکا گاؤں میں پہنچے۔ پنہاریاں ایک کنوئیں سے پانی بھر رہی تھیں۔

---

[1] دلّی میں وہ جگہ جہاں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا مزار ہے۔

وہاں ٹھہر کر پانی پیا اور بیمار کو بھی پلایا۔ چاند نکل آیا تھا اور ہم بڑ کے درخت کے نیچے پڑے تھے کہ جاٹ آئے اور دونوں مردوں کو پکڑ کر لے گئے۔ سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ اتنے میں دونوں مرد، خالہ کے میاں اور لڑکا خوش خوش آئے۔ خشکے کا بھرا ہوا نہال۔ شکر اور دہی بڑا ہُوا ان کے پاس تھا۔ دیکھ کر جان میں جان آگئی اور اس بُری طرح ٹوٹے کہ کنگلوں کو بھی مات کیا۔ رات ہم نے وہیں گذاری اور صبح کو ہم پانچوں آگے بڑھے۔ دوپہر تک تو ہم راستہ پر چلے۔ بیمار کی وجہ سے آگے نہ چلا گیا۔ باری باری کر کے تھوڑی تھوڑی دور سب لے جا رہے تھے۔ دھوپ تیز ہوگئی تو ہمارے تھکنے سے پہلے ہی بیمار کی حالت ردّی ہوگئی۔ آنکھیں بند ہوگئیں اور سانس نام کو رہ گیا۔ خالہ کبریٰ نے دیکھ کر کہا۔ "ارے خدا کے لیے ٹھہرو۔ ذرا دولہا کو تو دیکھو کیا ہو رہا ہے۔" میں آگے تھی۔ ایسا معلوم ہُوا کہ کسی نے کلیجہ میں گھونسا مارا۔ جان نکل گئی۔ ٹھٹکی تو کیا دیکھتی ہوں کہ منکا تک ڈھل گیا ہے! کیکر کے کمبخت درخت کے نیچے جہاں کانٹے ہی کانٹے پڑے تھے، ٹھہرے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے زمین صاف کی۔ ان کو لٹایا۔ دوپٹوں سے پنکھے جھلے تو خالہ نے کہا کہ "ہونٹوں پر پپڑیاں بندھی ہوئی ہیں۔ دو گھونٹ پانی کے ہوں تو حلق تر ہو جائے۔ شاید آنکھ کھولیں۔" مگر وہاں پانی کہاں۔ میں تو خدا کی قدرت کی اس دن ایسی قائل ہوئی کہ عمر بھر یاد رکھوں گی۔ رو رو کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ سامنے سے دو گورے کندھوں پر بندوق رکھے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ہم سب کی روح فنا ہوگئی ان میں سے ایک آگے بڑھا۔ ہم نے آنکھیں بند کرلیں اور کلمہ درود پڑھنے لگے کہ اب یہ گولی مار دیں گے۔ وضو بھی نصیب نہ ہُوا۔ چھپنے کی کہیں جگہ نہیں۔ بچنے کا موقع نہیں۔ کھڑے کانپ رہے تھے کہ گورے سر پر آ پہنچے۔ پوچھا "ہرن ہرن ہرن آیا ہرن آیا؟" خالہ کبریٰ نے ہمت کی اور کہا۔ "نہیں صاحب ہم نے نہیں دیکھا۔" یہ سن کر اُنھوں نے بیمار کو دیکھا اور پانی کی چھاگل دے کر کہا "پانی۔ پانی۔ پانی......" ہم لرزتے رہے اور وہ دونوں گورے پانی دے کر چلتے ہوئے۔ ہم نے جس طرح ہُوا چُلو میں پانی لے کر بیمار کے حلق میں ٹپکایا اور اُس نے ذرا آنکھ کھولی تو جان میں جان آئی۔ خدا اپنی قدرت کے کیا تماشے دکھاتا ہے۔ ملک الموت کو رحمت کا فرشتہ بنا دیا۔ بھوک کے مارے ہم بلبلا رہے تھے کہ سامنے ایک زخمی ہرن لنگڑاتا ہُوا آیا اور گر پڑا۔ خالہ نے اُسے پکڑ لیا تو سامنے سے ایک گڈریا بکریاں چراتا آیا اور کہنے لگا "یہ زخمی ہے مر جائے گا۔ لاؤ ذبح کر دوں۔" ہم نے پوچھا "تو مسلمان ہے" اس نے کلمہ پڑھا۔ ہم نے کہا۔ بسم اللہ۔ اُس نے چاقو نکال کر ذبح کیا۔ سامنے ہی گاؤں تھا۔ بھاگا ہُوا گیا اور سب چیزیں لے آیا۔ اسی نے کھال اتاری۔ اسی نے آگ جلائی۔ اسی نے ہنڈیا دی۔ وہ ہمارا مہمان ہُوا اور ہم اُس کے مہمان ہوئے۔

سب نے مل کر خوب کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ گڈریے کا یہ لڑکا اٹھارہ بیس برس کا ہوگا گاؤں کا رہنے والا جس کو شہر کی آب و ہوا چھو تک نہ گئی تھی۔ ایسا نیک اور شریف کہ قلعہ کے ایک لڑکے کو یہ بات نصیب نہ تھی۔ ہم کھا چکے تھے تو چار گھڑی دن باقی تھا ارادہ کیا کہ آگے بڑھیں۔ مگر اس نے نہ جانے دیا۔ مجھے اس کے بھولے پن پر بہت ہنسی آئی۔ کہنے لگا۔ "میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ ہم دو ماں بیٹے اس میں رہتے ہیں۔ تم لوگ رات کو مزے سے سوؤ۔ میں بھی رہوں گا۔" شام کو وہ اپنی ماں کو بھی لے آیا اور دو گھڑے پانی بھی بھر دیے۔ ایسی محبت کے لوگ میں نے تو عمر بھر نہیں دیکھے۔ جب ہم جانے کا نام لیتے وہ لڑکا منہ بنا کر کھڑا ہو جاتا اور کہتا۔ "مکئی اور باجرہ خدا کا دیا ہوا بہت ہے۔ یہیں رہو اور کھاؤ۔ اللہ سب مشکل آسان کر دے گا۔" میرے میاں ننھے دولہا جن کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ بچنے کی امید کب، گھڑی ساعت پر تھے۔ بغیر دوائی ٹھنڈائی کے ایسے اچھے ہوئے کہ اچنبھا ہو گیا۔ بخار اتر گیا اور جنگل کی ہوا اور پانی نے طاقت دی کہ سب دنگ رہ گئے۔ بے چارے امرو نے ہمارے واسطے نہر کے کنارے ایک جھونپڑی ڈال دی۔ وہ دونوں ماں بیٹے بھی وہاں آ گئے۔ یہاں چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ کوئی سات آٹھ قدم پر نیم کے درخت تھے اور دو تین املی اور جامن کے۔ ہم یہاں خوش تھے مگر ایک بات کا مجھ پر بڑا بوجھ تھا کہ اس غریب سے رشتہ، نہ ناتا، مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں خالہ نے ایک دن اس سے کہا کہ تم مجھے تھوڑا ریشم اور ایک کرتہ کی ململ دے دو۔ وہ جا کر لے آیا۔ تو انہوں نے تین چار دن میں ایسا کاڑھا کہ وہ تو وہ جس نے دیکھا وہی تعریف کرنے لگا۔ اب تو یہ کیفیت ہوئی کہ چاروں طرف سے لوگ آنے لگے اور ہماری کڑھائی کی دور دور تک خبر پہنچ گئی۔ امرو نے خرچ لینے سے انکار کر دیا تو ہم نے ایک ترکیب کی کہ اس کا کپڑا مفت کاڑھ دیتے تھے اور وہ اس کو بیچ آتا تو دام نہ لیتے۔ اس طرح اس کا خرچ پورا ہوتا اور ہمارا بھی — اب ہماری گذران خوب ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ شہر یہاں سے بیس اکیس کوس ہے اور امن چین بھی ہو گئی ہے مگر دل کچھ ایسے مر گئے تھے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ دم بدم کی خبریں آتے جاتوں سے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جس کو پوچھا یہ ہی پتہ چلا کہ پھانسی ہو گئی یا بھاگ گیا۔ جی حشمت میں جان پڑی تھی۔ کئی آدمیوں سے کہا کہ ان کی خبر لاؤ۔ مگر کسی کو گھر نہیں ملا۔ آخر ایک دن ننھے دولہا ہی دل کڑا کر کے پہنچے۔ اُپلوں کی گاڑیاں شہر جا رہی تھیں اور ان کا چودھری امرو کا پھوپھا تھا۔ وہ بھی ساتھ ہو لیا۔ دو بجے یہ لوگ روانہ ہو گئے کہ نو دس بجے تک ڈنڈو پر پہنچ جائیں گے۔ اور سویرے ہی سویرے بیچ کھوچ بارہ ایک بجے چل کھڑے ہوں گے۔ رات کو کہیں گیارہ بجے گاڑیاں لوٹیں تو ننھے دولہا نے کہا کہ شہر تو آدھے سے زیادہ کھد گیا۔ گھروں کا پتہ ہے نہ گھروالوں

کا، چچا حشمت کا گھر تو باقی ہے مگر خود اُن کا پتہ نہیں۔ برابر میں ایک روئی والا رہتا ہے۔ اس سے اتنا معلوم ہُوا کہ بال بچوں کو لے کر کہیں نکل گئے۔ اب تک کوئی خبر نہیں کہ جیتے ہیں یا مر گئے۔ ہاں ایک مخبر نے یہ بھی کہا کہ اُن کے چھوٹے لڑکے کو تو پھانسی ہوگئی۔ حسینو میری گودیوں کا کھیلا ہُوا تھا۔ سُنتے ہی جان نکل گئی۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ شہر جانے کا اوّل تو ارادہ ہی نہ تھا اور اگر شاذ و نادر بہت خیال کبھی بھولے بسرے آ بھی جاتا تھا تو اب بالکل نفرت ہوگئی۔

(راشد الخیری)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھیے۔

ا۔ برجیس کون تھی؟ ب۔ برجیس نے پانی کیسے حاصل کیا؟

ج۔ احمد عطار نے برجیس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

د۔ حکیم باڑسے کے داماد کی حرکت کا کیا نتیجہ نکلا؟

ہ۔ سفر میں پانی کیسے حاصل ہُوا؟ و۔ ننھے دولھا نے صحت کیسے پائی؟

ز۔ امرو نے کیا احسان کیا اور اس کا کیا بدلہ ملا؟

۲۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۳۔ ذیل کے الفاظ و محاورات کا مطلب لکھیے۔

ٹوپی اچھالنا۔ کنگلے۔ حلق۔ ملک الموت۔ چچا حشمت میں جان پڑی تھی۔ مُخبر۔

۴۔ مندرجہ ذیل کو تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیجیے۔

حشمت۔ نفرت۔ امّی جمی۔ باجرہ۔ بندوق۔ حلق۔ لنگڑاتا ہُوا۔

۵۔ مندرجہ ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

گڈریا۔ ہنسی۔ ترکیب۔ تعریف۔ شکر۔ خالہ۔ غریب۔

۶۔ واحد کے جمع اور جمع کے واحد لکھیے۔

خبر۔ حکیم۔ صبح۔ اطراف۔ جوانب۔ موقع۔ خیالات۔ کتب۔

۷۔ مندرجہ ذیل میں سے وہ الفاظ الگ کر کے لکھیے جو مذکر بولے جاتے ہیں۔

کنواں۔ کنڈی۔ گھونسا۔ چُلّو۔ دھوپ۔ کلیجہ۔ وضو۔ حلق۔ گھڑی۔ ململ۔ ہنڈیا۔ ریشم۔ ارادہ۔

۸۔ "بندوق۔ چاقو۔ نیزہ" وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو کسی آلے یا ہتھیار کے معنی دیتے ہیں۔ قواعد میں ایسے الفاظ کو اسم آلہ کہتے ہیں۔ اسم آلہ کی پانچ مثالیں تلاش کیجیے۔

ہم سے وطن کا مان

ہم مزدور، کسان
ہم سے وطن کا مان ——— ہمارا سارا پاکستان
ہم مزدور، کسان
ہم سے وطن کا مان ——— ہم سے وطن کی شان
کام کیا ہے، کام کریں گے
محنت بے آرام کریں گے
شب کو سحر انجام کریں گے
صبح کو گل اندام کریں گے
دل سے ہے یہ پیمان ——— ہمارا سارا پاکستان
ہم مزدور، کسان
ہم سے وطن کا مان ——— ہم سے وطن کی شان
سوات وچمن کی نرم ہوائیں
شاہ و خٹک کے نغمے گائیں
وارث شاہ کی ہیر سنائیں
پل پل محنت پر اکسائیں
محنت دین ایمان ——— ہمارا سارا پاکستان
ہم مزدور، کسان
ہم سے وطن کا مان ——— ہم سے وطن کی شان
راوی اور مہران کے دھارے
گیہوں چاول کے گہوارے
یہ دھرتی کے چاند ستارے
اپنی محنت کے ہرکارے
خیبر تا بولان ——— ہمارا سارا پاکستان
ہم مزدور کسان
ہم سے وطن کا مان ——— ہم سے وطن کی شان

(حمایت علی شاعر)

ایکِ دلچسپ سفر

پانی کی سطح چیرتی ہوئی ایک بہت بڑی قد و قامت والی چیز آہستہ روی کے ساتھ آگے بڑھتی چلی آرہی تھی۔ اِدھر ہماری لانچ نہایت سرعت کے ساتھ فراٹے بھرتی ہوئی اس چیز کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ ہماری چھوٹی سی لانچ میں جسے ایک فوجی چلا رہا تھا، کم و بیش اٹھارہ آدمی ٹھنسے ہوئے تھے۔ جوں جوں یہ عظیم جثے والی چیز ہمارے نزدیک آتی جا رہی تھی، میں اور میرے ساتھی حیرت و استعجاب سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جب ہماری لانچ بالکل اس کے نزدیک پہنچ گئی تو ہم نے دیکھا کہ بہت سی فوجی کشتیوں کو جوڑ کر ان کے اوپر مضبوط تختے بچھائے گئے ہیں اور انہیں کس کر آپس میں باندھ دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ بڑی چیز سطح آب پر ایک بحری جہاز کی شکل اختیار کر گئی تھی جسے ایک طاقتور فوجی لانچ آگے سے کھینچ رہی تھی اور اسی قسم کی دوسری طاقتور فوجی لانچ پیچھے سے دھکیل رہی تھی۔ اس کے اوپر نہ صرف پانچ سو کے قریب عورتیں، مرد اور بچے ہی سوار تھے بلکہ اس پورے گاؤں کی آبادی کا جس کے یہ لوگ تھے، گھروں کا پورا سامان بھی لدا ہوا تھا جن میں بستر، ٹرنک اور دوسری گھریلو چیزیں تھیں۔ ساٹھ سے زیادہ بھینس، گائیں، بیل اور گدھے بھی ایک سمت بندھے ہوئے تھے۔ لوگوں کے چہرے پژمردہ اور غمگین دکھائی دے رہے تھے کسی چہرے پر مسرّت کی ایک معمولی جھلک بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ دونوں فوجی لانچوں پر جو اس بیڑے کو کھینچ اور دھکیل رہی تھیں، پانچ پانچ فوجی جوان کھڑے تھے جن کے چہروں پر پختہ عزم، فرض شناسی اور مستعدی نمایاں نظر آرہی تھی۔ جب تک یہ لوگ ہمارے پاس سے نہیں گذر گئے، ہماری حیران نگاہیں اُنھیں دیکھتی رہیں۔

ہماری فوجی لانچ کے ہم سفروں نے بتایا کہ جھیل میں پانی کی سطح تیزی سے بلند ہونے کی وجہ سے یہاں کے کئی گاؤں پانی میں گھِر کر رہ گئے ہیں۔ جہاں سے فوجی جوان ان گِھرے ہوئے لوگوں کو نکال رہے ہیں اور ابھی جو لوگ آپ نے دیکھے ہیں یہ اسی طرح کے کسی پانی سے گھرے ہوئے گاؤں سے نکال کر لائے گئے ہیں۔ ہمارے اِس سفر کی رُوداد کا تعلق جولائی ۱۹۷۴ء سے ہے جب تربیلہ ڈیم میں تیزی سے پانی بھر رہا تھا اور پانی کا چڑھاؤ اتنا غیر متوقع تھا کہ جھیل کے علاقے کے کئی گاؤں لپیٹ میں آ گئے۔ ان لوگوں کو حکومت ان کی زمینوں، مکانوں اور جائیدادوں کا معاوضہ پہلے ہی ادا کر چکی تھی۔ انہیں بار بار کہا بھی گیا تھا کہ وہ یہ علاقہ چھوڑ کر کسی اپنی

پسند کی جگہ پہ چلے جائیں۔ لیکن وطن کی محبت انسان کی نس نس میں کچھ اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ اسے وطن چھوڑنا بہت ہی گراں گزرتا ہے۔

تربیلا جھیل کے متعلق تو آپ بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ پاکستان میں پنجاب اور سندھ کی زرخیز زمینوں کو جو دریا سیراب کرتے ہیں ان میں زیادہ دریا ایسے ہیں جن کے منبع مقبوضہ کشمیر میں ہیں۔ ایسے دریا بھی ہیں جو بھارت کی زمین سے ہو کر پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ بھارت سے ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہا کہ وہ ان دریاؤں پر بند باندھ کر ان کا رُخ نہ موڑ دے۔ آخر ایک منصوبے کے تحت یہ قرار پایا کہ دریائے سندھ کے بالائی علاقے میں سندھ پر ایک عظیم بند باندھا جائے، اور اِس بند سے پاکستان کی زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے خاطر خواہ پانی حاصل کیا جائے۔ اس کے لیے تربیلا کا مقام چُنا گیا کیونکہ تربیلا نامی گاؤں کے قریب وہ مقام تھا جہاں بند باندھنا مقصود تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں اس بند کا کام شروع ہوا۔ اور ۱۹۷۳ء کے آخر میں دنیا کے اِس عظیم ترین بند کی تکمیل ہوئی۔ تکمیل کے بعد ۱۹۷۴ء میں اِس میں پانی بھرنا شروع ہوا۔ اِس مِیلوں لمبی اور چوڑی جھیل کے نیچے بہت وسیع، عریض اور سرسبز علاقہ آیا۔ ساٹھ ہزار سے زیادہ آدمیوں کو اپنے گھر، اپنی زمینیں اور اپنے گاؤں چھوڑنے پڑے۔ وطن کی بہتری کی خاطر جو قربانی ان لوگوں نے دی وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ بہت سے لوگ تو تربیلا جھیل میں پانی بھرنے سے پہلے ہی چلے گئے لیکن بہت سے لوگ وطن کی محبت میں آخر وقت تک اپنے گھروں میں پڑے رہے یہاں تک کہ پانی کی سطح تیزی سے بلند ہونے لگی اور یہ لوگ محصور ہو کر رہ گئے۔ اُس وقت پاکستانی فوج نے جس جرأت، فرض شناسی اور جانفشانی کا ثبوت دیا اس پر ہماری قوم جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پانی میں محصور ہزاروں لوگ، اُن کے جانور اور گھریلو سامان سلامتی سے محفوظ مقامات پر منتقل ہو گئے۔ ممکن ہے کچھ جانور نقصان ہوئے ہوں لیکن ایک اِنسان کی جان بھی ضائع نہیں ہوئی۔

ہماری لانچ ان لوگوں سے جب کافی آگے بڑھ گئی تو ایک مقام پر لانچ میں پانی بھرنے لگا۔ دیکھنے پر معلوم ہُوا کہ لانچ کو جھیل کے اندر سے کوئی ایسی تیز چیز لگی ہے جس نے اس کے پیندے میں سوراخ کر دیا۔ سٹیل کی اس لانچ میں سوراخ ہونا ایک تعجب خیز امر تھا۔ شاید کسی ڈوبے ہوئے گاؤں کی مسجد کے بلند مینار کی نوک نے اس کے پیندے میں سوراخ کر دیا تھا۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ بھی کچھ خوف زدہ سے ہو گئے۔ کیونکہ پانی تیزی سے کشتی کے اندر بھر رہا تھا، اور ہم میں سے چند آدمی اسے نکال رہے تھے۔ ان مسافروں میں پانچ تو میرے ساتھی تھے اور دوسرے اسی علاقے کے لوگ تھے۔ جھیل میں پانی بھرنے کی وجہ سے یہ علاقہ ملک کے باقی حصے سے

کٹ چکا تھا۔ وہاں کھانے کی اشیاء اور دوسری ضروری چیزیں ناپید ہوگئی تھیں۔ یہ لوگ لانچ کے ذریعے بری پور آتے تھے اور وہاں سے کھانے پینے کی چیزیں لے جاتے تھے۔ ہماری لانچ میں بھی ہم چھ کے سوا اسی قسم کے لوگ تھے جو جھیل کی حدود سے باہر قیام پذیر تھے اور بری پور سے اپنے خاندان کے لیے سودا سلف لے کر جا رہے تھے۔ ہم چھ ساتھیوں کی منزلِ مقصود کھرکوٹ نامی گاؤں تھا جس کا بڑا حصہ زیرِ آب آچکا تھا۔ وہاں ہمارے جانے کا مقصد یہ تھا کہ اس کھرکوٹ میں ہمارے جدِّ امجد حضرت بابا سجاول قادری رحمتہ اللہ علیہ کا مزار تھا۔ بابا صاحب اپنے وقت کے بہت مشہور ولی اللہ ہو گزرے ہیں۔ ہم ان کی قبر کھول کر ان کے جسدِ خاکی کو تابوت میں منتقل کرنے کے بعد تابوت کو محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتے تھے۔ یہ محفوظ مقام سجاول شریف تھا، جو مانسہرہ کے نزدیک تھا اور وہاں کافی اراضی حاصل کر کے اس مقام کا نام ہی اس ولی اللہ کے نام پر سجاول شریف رکھا گیا تھا۔ ان کے جسدِ خاکی کو منتقل کرنے کی ہم نے حکومت سے باقاعدہ اجازت لے رکھی تھی بلکہ اس لانچ میں ہم جو تابوت لائے تھے وہ بھی تربیلہ ڈیم کے ڈائریکٹر نے بنوا کر دیا تھا۔ یہ تابوت بھی ہمارے ساتھ لانچ میں تھا۔ پراجیکٹ ڈائریکٹر نے اپنے ماتحت افسر اور دوسرے چار آدمیوں کو بھی ہدایت کی تھی کہ وہ ہمیں مدد دینے کے لیے فوراً کھرکوٹ پہنچیں۔ وہ لوگ دوسری لانچ میں سوار ہو کر آرہے تھے۔ ہماری لانچ ان کی لانچ سے بہت آگے نکل آئی تھی کہ یہ حادثہ پیش آیا۔ فوجی جوان جو لانچ چلا رہا تھا اس نے لانچ کا رُخ کنارے کی طرف پھیر دیا اور لانچ میں پانی بھرنے سے پہلے ہمیں کنارے پر لگا دیا۔ کنارے پر تھوڑی دور ایک چھوٹا لانچ اسٹیشن تھا جہاں دو لانچیں اور کئی پٹرول کے ڈبے پڑے تھے۔ فوج نے جھیل کے کنارے ایسے کئی چھوٹے لانچ سٹیشن قائم کر رکھے تھے کہ شدید مشکل وقت میں کام آئیں۔ فوجی جوان نے ہمیں لانچ سے اتار کر ایک دوسری لانچ میں بٹھایا جو سطحِ آب پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ ایک گھنٹے سے کم وقت میں ہم مزار کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اس نے لانچ کو درخت سے باندھا اور ہم سب نیچے اُتر کر مزار کے احاطے میں داخل ہو گئے۔

بابا صاحب کے مزار کے بیرونی احاطے میں پانی ٹخنوں تک پہنچ چکا تھا۔ ہم نے مزار کا دروازہ کھولا حضرت بابا سجاول کی قبر کے پاس پہنچے۔ دعا کی اور پھر قبر کو کھولنا شروع کیا۔ بیرونی دروازہ بند کر دیا تاکہ پانی مزار کے اندرونی احاطہ میں نہ داخل ہو۔ اتنے میں تربیلا ڈیم کے اسسٹنٹ پراجیکٹ ڈائریکٹر اور ان کے ساتھی بھی پہنچ گئے۔ اُنھوں نے قبر کے فوٹو وغیرہ لیے اس علاقے کے وہ لوگ جو تربیلا جھیل کی حدود سے باہر تھے اور ابھی تک نقلِ مکانی نہیں کر پائے تھے وہ بھی جمع ہونے شروع ہوئے۔ اِدھر جھیل کی سطح نہایت سرعت سے بلند ہو رہی تھی۔ ابھی

پانی ٹخنوں تک تھا کہ تھوڑی دیر بعد پنڈلیوں کو چھونے لگا۔ مزار کا دروازہ بند کرنے کے باوجود پانی دروازے کے لکڑی کے جوڑوں سے آہستہ آہستہ اندر آرہا تھا۔ ابھی ہم نے مزار کے اوپر کا خول اتارا ہی تھا کہ آسمان پر کالی بدلیاں چھا گئیں۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کافی دیر تھی مگر رات کا سماں پیدا ہو گیا۔ موسم کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم میں سے تین آدمی لانچ پر واپس جائیں اور وہ دوسرے آدمیوں کو ساتھ لے کر آئیں۔ اتنے میں یہاں جو تین آدمی ہوں گے وہ مقامی لوگوں کی مدد سے بابا صاحب کے جسدِ خاکی کو قبر سے تابوت میں منتقل کر لیں گے۔ میں دو آدمیوں کے ساتھ لانچ میں بیٹھ گیا اور ہمارے تین ساتھی وہیں رہ گئے۔ ہمارے لانچ میں بیٹھنے کے بعد وہاں رہ جانے والوں پر جو گذری وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

ہم نے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور لانچ مزار کے احاطے سے نکل کر جھیل کی وسیع سطح پر نہایت تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ فوجی جوان موسم کی وجہ سے لانچ کی رفتار کو متواتر بڑھا رہا تھا۔ کالی بدلیاں ہر طرف سے امڈ آئی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ اچانک جھیل کی سب سے عریض جگہ پر کشتی کا انجن بند ہو گیا۔ فوجی نے اُسے چلانے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ انجن بدستور بند رہا۔ اب تو ہم سب کو بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ جھیل کی لمبائی اور چوڑائی کے اعتبار سے ہم ہر طرح سے جھیل کے وسط میں تھے۔ ہوا کی تیزی کی وجہ سے جھیل کی سطح پر لہریں اُٹھنے لگی تھیں جس کی وجہ سے کشتی ہچکولے کھا رہی تھی۔ شام کے جھٹ پٹے کے ساتھ بوندا باندی بھی ہونے لگی تھی۔ اِس تیرگی میں مجھے اپنے ساتھیوں کے متفکر چہرے اب صاف نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ دور جنوب میں تربیلہ بند کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ میں اِس صورتِ حال کے متعلق سوچ رہا تھا۔ گھر والے مطمئن ہوں گے کہ بابا صاحب کا جسد منتقل کرنے گئے ہیں۔ مزار پر رہ جانے والے ساتھیوں کو اطمینان ہوگا کہ ہم رات کو گھر پہنچ کر بابا صاحب کے عقیدت مندوں کو پیش آنے والے حالات سے باخبر کر دیں گے۔ لیکن یہاں یہ اُٹھتی ہوئی لہریں اور یہ ہوا کے تھپیڑے خدا جانے لانچ کو کہاں سے کہاں لے جائیں گے۔ خدا نخواستہ اگر یہ اُلٹ گئی تو پھر ہمارا مدفن تربیلہ جھیل ہوگی، اور ہمارے پسماندگان کو کوئی صحیح اور پیش آنے والے حالات سے آگاہ بھی نہیں کر سکے گا۔ میرے ساتھی نہ جانے کیا سوچ رہے تھے لیکن ہم میں سے کوئی دُوسرے کے ساتھ بات نہیں کر رہا تھا۔ اِس گہری خاموشی میں فوجی جوان ہم سب سے بے نیاز انجن کو بدستور درست کرنے میں لگا ہُوا تھا۔ انجن کو بند ہُوئے آدھ گھنٹہ گذر چکا تھا۔ جھیل کی متلاطم سطح کو اندھیرے نے ڈھانپ لیا تھا۔ اچانک گھرر کی آواز کے ساتھ

لانچ کا انجن جاگ اُٹھا اور لانچ جھیل کی سطح پر تیزی کے ساتھ دوڑنے لگی۔ ہم سب کی جان میں جان آئی۔ ہم سب میں شاید فوجی جوان ہی ایسا آدمی تھا جس کے سامنے اس کا فرض تھا اور فرض کو پُورا کرنے کے لیے اس میں عزم کی بلندی تھی۔

لانچ نے رات کے آٹھ بجے ہمیں تھپلہ پہنچایا جو اس وقت فوجی لانچوں کا بڑا اسٹیشن اور فوجی کیمپ تھا۔ دُوسرے دن پھر ہم چند ساتھیوں کے ہمراہ جب لانچ سے نوگوان کے لانچ اسٹیشن پر اُتر کر کھرکوٹ کی طرف چلنے لگے تو ہمارے تینوں ساتھی بھی کھرکوٹ سے واپس ہوکر نوگراں پہنچ چکے تھے۔ اُنھوں نے ہمیں بتایا کہ اگلے دن ہمارے چلے آنے کے ایک گھنٹہ بعد اُنھوں نے بابا صاحب کے جسدِ خاکی کو ان کی قبر سے نکال کر تابُوت میں منتقل کر دیا تھا اور پھر اس تابوت کو پانی کی حدود کے بہت باہر ایک اُونچی جگہ امانت کرکے دفن کر دیا ہے۔ ہم اسے چند دنوں بعد اہتمام کے ساتھ وہاں سے سیجاول شریف منتقل کریں گے۔ ہم بھی ان کے ساتھ واپس آئے اور پھر ایک ہفتہ بعد بڑے اہتمام کے ساتھ ہزاروں آدمیوں کے ساتھ ان کے تابوت کو سیجاول شریف منتقل کیا۔

اِس سفر میں جس چیز سے میں بہت متاثر ہُوا۔ وہ پاکستانی فوج کی فرض شناسی، بلند ہمتی اور کارکردگی تھی۔ اُنھوں نے پانی میں گھرے ہوئے ہزاروں انسانوں کو ان کے پورے سامان کے ساتھ محفوظ مقام پر پہنچانے میں جس بلند حوصلگی کا ثبوت دیا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ تربیلا ڈیم کے متاثرین کی وطن کے مفاد کے لیے عظیم قربانی بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

مَشق

۱۔ تربیلا ڈیم کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

۲۔ تربیلا جھیل میں لوگوں کے گھر جانے کی کیا وجہ تھی؟ ۳۔ جھیل میں گھرے ہوؤں کو کیسے نکالا گیا؟

۴۔ لانچ کیا چیز ہوتی ہے؟ اور کس کام آتی ہے؟ ۵۔ تربیلہ ڈیم بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

۶۔ مندرجہ ذیل فقروں میں ان الفاظ کو مناسب اور درست جگہ لگائیے۔ نیز ان الفاظ کے معانی علیحدہ لکھیے:۔ پژمردہ، فرض شناسی، سرایت، منتقل، جھٹ پٹے۔

۱۔ اُنھوں نے اپنا تمام سامان ــــــ کر دیا ہے۔ ۲۔ لوگوں کے چہرے ــــــ دکھائی دے رہے تھے۔

۳۔ وطن کی محبت ان کی نس نس میں ــــــ کر گئی۔

۴۔ فوجی سپاہی کی ــــــ قابلِ داد ہے۔

۵۔ شام کے ــــــ ہر چیز دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز

[تحریری کام کا گھنٹہ ـ ناصر صاحب حاضری لے کر فارغ ہوئے ہیں]

ناصر صاحب :- آج ہم یہ گھنٹہ کچھ مفید گفتگو میں گذاریں گے۔ میں سوال کروں گا آپ جواب دیں گے۔ آپ سوال کریں گے میں وضاحت کروں گا۔ ہاں تو سعید آپ بتائیے "خلیفۂ راشد" کسے کہتے ہیں؟

سعید :- جناب ایک دن عربی کے سبق میں آپ نے راشد کے معنی بتاتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ لفظ رُشد سے نکلا ہے جس کے معنی ہدایت کے ہیں۔ چنانچہ راشد ہدایت یافتہ کو کہتے ہیں۔

ناصر صاحب :- مجھے مسرّت ہوئی کہ آپ نے میری باتیں یاد رکھیں۔ لیکن اس وقت میرا سوال یہ ہے کہ خلیفہ راشد کسے کہتے ہیں۔ میں اس کی کچھ وضاحت کیے دیتا ہوں کہ جمع کے طور پر یہ لفظ ہماری تاریخ کی چند نہایت ہی بزرگ ہستیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

سعید :- جناب! شاید آپ کی مراد خلفائے راشدین سے ہے!

ناصر صاحب :- بالکل صحیح، ہاں تو اسلم آپ بتائیے خلفائے راشدین میں کون کون بزرگ شامل ہیں؟

اسلم :- جناب! حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ

ناصر صاحب :- درست، لیکن کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ انھیں خلفائے راشدین کیوں کہتے ہیں؟

سعید :- جناب! اس لیے کہ ان پاک ہستیوں نے خدا اور رسولؐ کے احکام کی مکمّل پابندی کرتے ہوئے پورے عدل اور انصاف کے ساتھ حکومت کی۔

ناصر صاحب :- بالکل صحیح۔ ہمیں فخر ہے کہ ان پاکباز ہستیوں نے اپنی نجی اور اجتماعی زندگی میں شریعت کے احکام کو پورے طور پر حاوی کر لیا تھا اور برضا و رغبت ہر وہ کام انجام دیا جس سے خدا اور اس کے رسُول کی خوشنودی حاصل ہوتی ہو۔ انھوں نے ذاتی مفاد پر امّت کے مفاد کو ترجیح دی اور دیانت، صداقت، قربانی اور ایثار کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھا۔ اچھا، تو اب آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ کیا ان بزرگوں کے علاوہ ہماری تاریخ میں کوئی دُوسری ایسی شخصیت بھی گذری ہے جس کے نام کے ساتھ "راشد" کا لفظ لکھا جاتا ہو؟ اکرم! آپ بتائیے۔

اکرم :- جناب! شاید حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نام کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ناصر صاحب :- شاباش! آئیے آج ہم انھیں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تاکہ اس عظیم شخصیت

کی زندگی کے مختلف گوشے آپ پر نمایاں ہو جائیں؟

سبھی ایک زبان ہوکر :- جناب! کیوں نہیں؟ اس سے تو ہمیں بڑا فائدہ ہوگا۔

ناصر صاحب :- اچھا صاحب، تو قصہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد بنو امیّہ نے عالمِ اسلام میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ لیکن چند در چند اسباب کی بنا پر خلافت کی وہ شان برقرار نہ رکھ سکے جو پہلے چاروں خلفاء سے مخصوص تھی، عدل، انصاف، خدا ترسی، نیکی، دیانت اور صداقت ایسی صفات سے خلفائے بنو امیّہ عام طور پر محروم تھے۔ بیت المال جو خلیفہ کے پاس بطورِ امانت تھا اور پوری امّت کا اس پر حق تھا۔ بنو امیّہ کے عہد میں اس کی ساری رقم خلیفہ کی ذات اور اس کے امراء اور عزیزوں کی عیّاشی پر صرف ہونے لگی۔ خلافتِ راشدہ کے دور کی سادہ زندگی قطعاً مفقود ہوگئی۔ اونچے اونچے محلات تعمیر ہونے لگے۔ زرق برق ملبوسات اور زیورات کی نمائش ہونے لگی۔ راتوں کو ناچ، رنگ اور موسیقی کی محفلیں بپا ہونے لگیں۔ شراب کے خُم کے خُم لنڈھائے جانے لگے غرض بنو امیّہ نے وہی ٹھاٹ باٹ اختیار کر لیے جن کی داستان ہمیں قدیم روما کی تاریخ سنا رہی ہے۔ اسی پر بس نہیں۔ اقتدار کو بچانے کے لیے بے گناہوں اور معصوموں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کبھی مدینے کی آبرو لٹتی ہے اور کبھی حرمِ کعبہ آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آتا ہے۔ کبھی کربلا کے میدان میں، خانوادۂ رسولؐ کو خاک و خون میں تڑپایا جاتا ہے اور کبھی عبد اللہ بن زبیرؓ کی نعش برسرِ عام لٹکائی جاتی ہے۔ بنو امیّہ نے خلافت کی اصل روح ہی برقرار نہ رہنے دی۔ اس کی بجائے اسے جابر شہنشاہیت میں بدل دیا۔

اسلم :- حضور، آپ کا قطعِ کلام ہوتا ہے لیکن اس کی ذرا وضاحت فرما دیجیے کہ بنو امیّہ نے خلافت کو کیوں کر شہنشاہیت میں بدل دیا؟

ناصر صاحب :- بھئی، پہلے تو جو حالات میں نے بیان کیے ہیں، اُنھی سے اندازہ کر لیجیے کہ آیا ایسی صورت خلافت کے شایانِ شان ہے؟ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اسلام کی رُو سے خلافت کوئی موروثی چیز نہیں۔ خلیفہ کے لیے لازم ہے کہ وہ صاحبِ علم ہو، متّقی ہو اور انتظامی امور انجام دینے کی اہلیّت رکھتا ہو۔ پھر پوری امّت کی رضامندی سے اس کا انتخاب عمل میں آیا ہو۔ خلیفہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد اپنے آپ کو امّت کے دوسرے افراد سے ممتاز نہ سمجھے، اور اپنے اعمال کے لیے امّت کے سامنے خود کو جواب دِہ تصوّر کرے۔ بنو امیّہ نے ان

تمام امور کی قید اُٹھا کر وہ باتیں اختیار کرلیں جو جابر شہنشاہیت کا لازمہ ہیں۔

سعید :۔ جناب، تو کیا یہ سب کچھ دیکھتے سنتے اُمّت خاموش رہی؟

ناصر صاحب :۔ نہیں صاحب، اس کے خلاف وقتاً فوقتاً احتجاج ہوتا رہا۔ لیکن نہایت سختی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ بہرکیف یہی حالات تھے جن میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خلافت کا کاروبار سنبھالا۔ آئیے پہلے ان کی ابتدائی زندگی پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اموی خلیفہ عبدالملک کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ان کے والد عبدالعزیز، عبدالملک کی طرف سے مصر کے گورنر تھے۔ ان کی والدہ امّ عاصم حضرت عمر فاروقؓ کی پوتی تھیں۔ آپ کی پیدائش ۶۱ھ میں حلوان کے مقام پر ہوئی۔ سنِ تمیز کو پہنچے تو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے دور کے جید علماء کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ کو قرآنِ مجید اور حدیث کا درس لینے کے لیے مدینہ منورہ بھیج دیا گیا۔ یہاں بہت جلد آپ نے قرآنِ مجید حفظ کرلیا۔ علمِ حدیث کی تعلیم حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اور حضرت انس ابن مالکؓ جیسی جلیل القدر ہستیوں سے حاصل کی فارغ التحصیل ہوئے تو اپنے زمانے کے کامل محدّث تھے۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ اس دور میں آپ کے پائے کا کوئی دوسرا محدّث نہ تھا۔ اپنی فطرت میں ایک صالح انسان تھے۔ تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور آپ عادات و اطوار میں بنو امیّہ کے عیش پسند افراد سے بالکل مختلف نکلے۔ وہ ایک خالص دیندار انسان اور باعمل عالمِ دین تھے۔

جب آپ کے والد کا انتقال ہوگیا تو خلیفہ عبدالملک نے انہیں مصر سے دمشق طلب کرلیا۔

سعید :۔ جناب! آپ بُرا نہ مانیں تو ایک سوال کروں؟

ناصر صاحب :۔ ہاں ہاں، بھئی، بڑے شوق سے پوچھیے۔

سعید :۔ آپ مصر کیوں گئے تھے؟

ناصر صاحب :۔ دیکھیے، میں نے بالکل آغاز میں کہا تھا کہ خلیفہ عبدالملک کی طرف سے آپ کے والد مصر کی گورنری پر فائز تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ یہ بھی وہیں تھے۔

سعید :۔ جناب! معافی چاہتا ہوں، میں یہ بالکل بھول گیا تھا۔

ناصر صاحب :۔ خیر، کوئی بات نہیں، ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ خلیفہ عبدالملک نے آپ کو مصر سے دمشق طلب کرلیا، اور اب کیا ہُوا۔ خلیفہ نے اپنی بیٹی فاطمہ کی شادی آپ سے کر دی۔ شادی کے بعد آپ شاہی محل میں رہنے لگے۔ ابتدا میں آپ کسی حد تک جاہ و جلال کے شوقین بھی تھے اس لیے آپ کی ہدایت پر آپ کا محل بارونق

آراستہ و پیراستہ رہتا۔ کارندے اس کی آرائش و زیبائش کے لیے نئے سے نیا سامان اکٹھا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ نفیس سے نفیس لباس زیب تن کرتے اور ایک بار جس کپڑے پر کسی کی نظر پڑ جاتی فوراً اُتار دیتے۔ اس دور میں آپ کو خوشبو اور عطریات سے بڑی رغبت تھی، محل کا گوشہ گوشہ مختلف خوشبوؤں سے ہر وقت مہکتا رہتا۔ یہاں تک کہ ڈاڑھی پر بھی عنبر کا سفوف چھڑکتے۔ بیش قیمت موتی اور عمدہ زیورات آپ کو بہت پسند تھے۔ آپ کی رفیقۂ حیات کے جسم پر ہر وقت لاکھوں درہم کے زیورات ہوتے تھے۔

اسلم :۔ لیکن جناب ہمارے بزرگ تو ان کی سادگی کا ذکر بڑی شد و مد سے کرتے ہیں۔

ناصر صاحب :۔ ہاں صاحب، یہ وہی عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں۔ لیکن یاد رکھیے کہ یہ بالکل ابتدائی دَور کی بات ہے۔ خلافت کے بعد آپ کو ان کی زندگی کا نقشہ ہی بدلا ہُوا نظر آئے گا۔ خیر اسی اثنا میں خلیفہ عبدالملک کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ولید تخت نشین ہُوا، حجاز پر بنو امیّہ کے مقرّر کیے ہوئے حکام نے وہاں کے شرفاء کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ ان کی بے جا سختیوں سے بے حد پریشان تھے، خلیفہ کے دربار میں ان کی طرف سے بار بار شکایت ہوئی تو اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو وہاں کا حاکم مقرّر کر دیا۔ آپ نے یہ منصب قبول کرتے وقت ولید سے یہ شرط منوائی کہ میں دوسرے گورنروں کی طرح رعایا پر ظلم نہیں ڈھاؤں گا۔ اس پر مجھے ہرگز مجبور نہ کیا جائے۔ مدینے پہنچ کر آپ نے وہاں کے علماء اور شرفاء کو اکٹھا کیا اور ان پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل قائم کر دی، اور بتا دیا کہ آئندہ حکومت کا کام آپ ہی کے مشوروں سے ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ آپ بھی مجھ سے تعاون کریں۔ کہیں ظلم و ستم یا زیادتی دیکھیں تو فوراً میرے علم میں لائیں تاکہ میں اس کی روک تھام کر سکوں۔ آپ جانتے ہیں اس کا کیا اثر ہُوا؟

اسلم :۔ جناب! ظاہر ہے کہ وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے۔

ناصر صاحب :۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں، آپ کی گورنری کے زمانے میں حجاز میں امن و امان اور عدل و انصاف کا دور دورہ تھا۔ لوگ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے اور آپ کے وجود کو اللہ کی خاص رحمت تصوّر کرتے تھے۔ آپ ہی کے دَور میں مسجدِ نبویؐ کی نئے سرے سے تعمیر ہوئی۔ خلیفہ ولید کو نئی نئی عمارتیں بنوانے کا خاص شوق تھا۔ اس نے آپ کو لکھا کہ مسجدِ نبویؐ کی پُرانی عمارت کو گرا کر اسے ازسرِ نَو تعمیر کرایا جائے اور اس سے متصل جو حجرے اور مکانات ہیں انہیں گرا کر مسجد کو وسعت دی جائے۔ ان حجروں اور مکانوں کے مالکوں کو یا تو قیمت ادا کی جائے اور اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوں تو

زبردستی انہیں مسجد میں شامل کر لیا جائے۔

سعید:۔ جناب! کیا کوئی مکان یا زمین مسجد کے لیے زبردستی حاصل کی جا سکتی ہے؟

ناصر صاحب:۔ آپ نے بڑا اچھا سوال کیا ہے۔ لیکن صاحب! بنوامیّہ کے ہاں اس کا عام دستور تھا مگر آپ مجھے اپنی بات تو مکمل کرنے دیجیے۔ تو بھئی، کوئی مکان یا حجرہ زبردستی حاصل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بعض لوگوں نے اپنے مکان قیمت لے کر مسجد کے لیے دے دیے اور بعض نے سعادت حاصل کرنے کی غرض سے بلا قیمت آپ کے حوالے کر دیے۔ ان تمام امور کی تکمیل کے بعد آپ نے پُرانی عمارت گروائی اور مدینے کے علماء کے ہاتھوں نئی عمارت کی بنیاد رکھوائی۔ ولید نے مسجد کے نقش و نگار اور منبت کاری کے لیے لاتعداد کاریگر اور بے اندازہ سامان منگوا کر دیا۔ اس کام میں آپ کے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی کاریگر ایک جھاڑ بنا کر فارغ ہوتا تو آپ اسے مقرّرہ مزدوری کے علاوہ تیس درہم بطورِ انعام عطا فرماتے۔ آپ نے صرف قبلے کے رُخ کی دیوار اور اس کے طلائی کام پر تقریباً پینتالیس ہزار اشرفیاں صرف کیں۔ پوری کی پوری عمارت اعلیٰ درجے کے پتھر کی بنوائی اور تمام دیواروں اور چھت پر طلائی کام اور میناکاری کروائی۔ آپ نے مسجد میں خوب صورت محرابیں بنوائیں جن سے مسجد کا حُسن دوبالا ہو گیا۔ مسجد میں ایک فوّارہ بھی تعمیر کرایا۔ اس میں پانی لانے کے لیے کئی کنوئیں کھدوائے۔ پھر ان میں نل نصب کروائے۔ مکمل تین سال تک آپ ایک مزدور کی طرح مسجد کی تعمیر میں شریک رہے اور کام کی نگرانی کرتے رہے۔ اکرم! کیا آپ نے حجّاج بن یوسف کا نام سنا ہے؟

اکرم:۔ جناب! وہی جو بنوامیّہ کی طرف سے عراق کا حاکم تھا؟

ناصر صاحب:۔ ہاں، بالکل وہی۔ تو صاحب قصّہ یہ ہُوا کہ اُس شخص نے عراق میں ظلم وستم کا ایک بازار گرم کر رکھا تھا۔ وہاں سے لوگ بھاگ بھاگ کر حجاز میں پناہ لے رہے تھے۔ اُن کے مصائب کی داستانیں سُن سُن کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ آبدیدہ ہو ہو جاتے۔ بالآخر آپ نے اس کی شکایت خلیفہ کو لکھ دی۔ حجّاج بڑا مکّار اور چالباز تھا۔ اسے جب اس شکایت کا علم ہُوا تو اس نے آپ کے خلاف ایک چال چلی۔ اس نے خلیفہ کو لکھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ہاں عراقیوں کو پناہ دے رکھی ہے اور وہ انھیں اس کے خلاف بغاوت پر اُکسا رہے ہیں۔ لہٰذا جب تک اس کا سدِّ باب نہ کیا جائے عراق میں امن و امان قائم نہیں رہ سکتا۔ خلیفہ ولید چونکہ شکّی مزاج تھا اور سخت گیر بھی اس لیے حجّاج کی چال کام کر گئی اور ۹۳ھ میں آپ کو حجاز کی گورنری سے ہٹا دیا گیا۔ ہاں، تو بھئی گھنٹی کی آواز آ رہی ہے، باقی باتیں انشاء اللہ کل ہوں گی۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز

(۲)

[دوسرا دن — تمام طلبہ ہمہ تن شوق بنے بیٹھے ہیں]

ناصر صاحب: اسلم، کل ہم نے سبق کہاں چھوڑا تھا؟

اسلم: جناب، آپ یہاں تک پہنچے تھے کہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز تین سال تک ایک مزدور کی طرح مسجد کی تعمیر میں شریک رہے۔

ناصر صاحب: ہاں، تو پھر یہ ہوا کہ ۹۶ھ میں خلیفہ ولید اس دنیا سے چل بسا اور اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان خلافت کے منصب پر فائز ہوا۔ وہ بڑی نیک اور صالح طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنا مشیرِ خاص بنا لیا اور حکومت کے ہر معاملے میں آپ سے مشورے لینے لگا۔ آپ نے ہمیشہ اسے قرآن حکیم اور سنتِ نبوی پر عمل کرنے کی صلاح دی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ نہایت سکون اور اطمینان سے حکومت کرنے لگا۔ سلیمان کا جب آخر وقت قریب آیا، تو مشہور محدّث رجاء بن حیوۃ سے صلاح مشورے کے بعد اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ولی عہد نامزد کر دیا۔ لیکن وصیّت نامہ اس کے انتقال تک خفیہ رکھا گیا کیوں کہ عبدالملک کی اولاد کی جانب سے فساد کا اندیشہ تھا۔ بہرحال سربمہر تحریر پر ان سے پہلے ہی بیعت لے لی گئی تھی، خود حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سلیمان کی وفات تک اس کے مضمون سے بے خبر تھے۔ اس کا انہیں اس وقت علم ہوا جب سلیمان دنیائے فانی سے عالمِ آخرت کا سفر کر چکا تھا۔ چنانچہ یہ خبر سنتے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سناٹے میں آ گئے۔ تھوڑی دیر تک ان پر سکتے کی سی حالت طاری رہی، لیکن جب اپنی ذمّے داریوں کا احساس ہوا تو فوراً یہ بھاری بوجھ اٹھانے کے لیے کمرِ ہمت باندھی۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ خلیفہ بنتے ہی وہ بالکل بدل گئے۔ جوں جوں فرائض کا احساس شدید ہوتا جاتا تھا، آپ کی پریشانی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ اسی عالم میں گھر پہنچے، ایک کنیز نے چہرے سے دل کی کیفیت بھانپ لی اور پریشانی کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا "اس سے بڑھ کر پریشانی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ مجھے اسلام کا خلیفہ بنایا گیا ہے، جس کے بعد

کوئی مسلمان ایسا نہیں رہ جاتا جو مجھ پر حق نہ رکھتا ہو اور ظاہر ہے کہ اس حق کی ادائیگی سے بڑھ کر مجھ پر کوئی اور فریضہ ہو ہی نہیں سکتا" چونکہ آپ کا خیال تھا کہ خلیفہ کا انتخاب عام مسلمانوں کو کرنا چاہیے اس لیے اپنے حق میں سلیمان کے وصیّت نامے کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ خلافت سے دست بردار ہونے پر تیار ہو گئے اور عام مسلمانوں کو اکٹھا کر کے اپنا خیال ان پر ظاہر کر دیا، لیکن اس کے جواب میں انھوں نے یک زبان ہو کر آپ کی خلافت کی تائید اور حمایت کر دی۔ جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو یہ یقین ہو گیا کہ کوئی بھی مسلمان ان کے خلیفہ بننے سے ناخوش نہیں ہے تو انھوں نے بخوشی اس منصب کی ذمّہ داریاں سنبھال لیں اور اس کے بعد ایک نہایت دلپذیر تقریر کی جس میں صحیح اسلامی خلافت کی خصوصیات واضح کی گئی تھیں۔ کیوں بھئی اکرم، بات تو سمجھ میں آ رہی ہے؟

اکرم:۔ جناب، میں تو آپ کی گفتگو میں گویا کھو سا گیا ہوں اور میری خواہش ہے کہ اس طرح کی باتیں ہماری محفلوں میں اکثر ہوتی رہیں تاکہ ہم اپنے بزرگوں کے شاندار کارناموں سے واقفیت حاصل کرتے رہیں۔

ناصر صاحب:۔ ہاں تو صاحب، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے دورِ خلافت میں بنو امیہ کے تمام جابرانہ قوانین منسوخ کر دیے اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شاہی خاندان کے افراد اور بڑے بڑے حکام نے لوگوں کی جن جائیدادوں اور زمینوں پر ناجائز طور پر قبضہ جما رکھا تھا، اصل مالکوں کو فی الفور واپس کرا دیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے پہل بھی خود ہی کی اور اپنی جاگیر واپس کر دی۔

سعید:۔ لیکن جناب، کیا اسلام جاگیرداری کو ناجائز قرار دیتا ہے؟

ناصر صاحب:۔ ہاں، صاحب، اسلام ہرگز اس کا روادار نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسانوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انھیں اپنا محکوم بنائے رکھے۔ محنت تو اور کریں اور وہ بے کار بیٹھا للّے تللّے کرتا رہے اور پھر محنت کش بیچارے کی یہ حالت ہو کہ اسے اور اس کے بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا بھی میسّر نہ آتا ہو۔ جاگیر داری ہو یا سرمایہ داری، اسلام انھیں کسی بھی صورت میں جائز قرار نہیں دیتا۔ ہو گئی آپ کی تسلّی؟

سعید:۔ جی ہاں۔

ناصر صاحب:۔ بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنی جاگیر واپس کر دی۔ اس موقع پر خیر خواہوں نے ان سے کہا بھی کہ اگر یہ جاگیر آپ واپس کر دیں گے

تو آپ کی اولاد کے لیے کیا رہ جائے گا۔ مگر اس کے جواب میں آپ نے صرف یہی کہا کہ میں انھیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے خاندانِ بنوامیہ کے افراد کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ اے مروان کے بیٹو! تم نے جو دولت جمع کر رکھی ہے یہ حد سے زیادہ ہے۔ امت کے آدھے یا اس سے زیادہ مال پر تم قابض ہو۔ میں یہ تمام مال امت کو لوٹانا چاہتا ہوں۔ اس پر بنوامیہ کے افراد مارے غصے کے آگ بگولا ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ مال اور یہ جائیدادیں ہم اس وقت تک واپس نہیں کریں گے جب تک ہمارے سر تن سے جدا نہ ہو جائیں۔ یہ ہمارے آبا و اجداد کو کافر اور ہماری اولاد کو مفلس بنانے کی کوشش ہے۔ مگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کی اس دھمکی کی قطعاً پروا نہ کی اور جواب میں کہا کہ اس کام میں جو شخص مجھ سے تعاون نہیں کرے گا اسے ذلت اور رسوائی اٹھانا پڑے گی۔ اس کے بعد آپ نے جاگیروں کی سندیں منگوائیں اور ایک ایک سند کو قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکنے لگے۔ اس طرح خاندانِ بنوامیہ کی تمام جاگیریں چھن گئیں اور وہ سب اصل مالکوں کو واپس کر دی گئیں۔ پھر ان کے پاس جو دولت تھی، وہ سب بیت المال میں جمع کرا دی یہاں تک کہ بیوی کے پاس جواہرات اور زیورات بھی نہ رہنے دیے۔ ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ان کی بیوی کے پاس ایک قیمتی پتھر تھا جو انھیں ان کے باپ خلیفہ عبدالملک نے دیا تھا اور وہ اسے بہت عزیز رکھتی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان سے کہا کہ یا تو اسے بیت المال میں جمع کرا دو یا مجھ سے الگ ہو جاؤ۔ بیوی نے وہ پتھر فوراً بیت المال میں داخل کر دیا۔

صوبوں کے حکام کو بھی انھوں نے سختی کے ساتھ تاکید کی کہ جن جن املاک پر ناجائز قبضہ ہوا ہے وہ سب اصل مالکوں کو واپس کر دی جائیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر آپ نے بیت المال کی اصلاح کی جانب توجہ دی۔ آپ نے اپنے خاندان کے تمام وظائف بند کر دیے اور خرچ کی وہ تمام مدیں بھی ختم کر دیں جو خلیفہ کی شان و شوکت اور عیش و عشرت کے لیے تھیں۔ آپ کے خلیفہ بننے کے بعد جب اصطبل کے داروغہ نے خلیفہ کی سواری کے اخراجات کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ سواری کے جانور اور سامان بیچ ڈالو اور اس سے جو رقم حاصل ہو اسے بیت المال میں جمع کرا دو۔ میری سواری کے لیے میرا خچر کافی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ رات کو جب تک خلافت کا کام کرتے اس وقت تک وہ شمع جلاتے جس میں بیت المال کے پیسے کا تیل ہوتا، اور جب نجی کام کرنے لگتے اپنے پیسے کے تیل کا چراغ جلاتے۔ اس طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز

نے تھوڑی ہی مدت میں حکومت کے تمام شعبوں کی اصلاح کر دی۔ بیت المال کو ہمیشہ انھوں نے قوم کی امانت سمجھا اور اس ضمن میں معمولی سے معمولی بات پر آپ کی نظر ہوتی۔ آپ نے تمام غیر ضروری اخراجات میں تخفیف کر دی یہاں تک کہ کاغذ، قلم اور روشنائی کے اخراجات میں بھی اضافے کے روادار نہ تھے۔ ان کے نزدیک بیت المال کا صحیح مصرف یہ تھا کہ اس کی رقم مسلمانوں پر خرچ کی جائے۔ چنانچہ آپ نے معذوروں اور اپاہجوں کے وظیفے مقرر کیے۔ نادار مسلمانوں کے قرضوں کی ادائیگی کا بندوبست کیا۔ شیر خوار بچوں کی پرورش کا اہتمام کیا۔ فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہر شہر میں لنگر خانے بنوائے۔ بنو امیہ کے ظلم و ستم کو بند کرنے کے لیے آپ نے اس خاندان کے بااثر افراد کو اعلیٰ اعلیٰ عہدوں سے ہٹا دیا۔ حجاج کے خاندان کو جو ظلم و ستم میں ضرب المثل تھا، یمن میں جلا وطن کر دیا۔ اموی حکام کی ظالمانہ سزائیں یک قلم موقوف کر دیں اور سزا کے صرف شرعی طریقوں کو بحال رکھا۔ نومسلموں سے جزیہ وصول کرنے کا جو طریقہ حجاج نے جاری کیا تھا، اسے منسوخ قرار دیا۔ ان اصلاحی کارروائیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ملک میں خوشحالی عام ہو گئی اور امن و امان کو فروغ حاصل ہو گیا، اور عوام یہ محسوس کرنے لگے گویا خلافتِ راشدہ کا عہد از سرِ نو زندہ ہو گیا ہے۔

اکرم :- کیا بنو امیہ کے عیش پسند افراد نے اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا؟

ناصر صاحب :- کیوں نہیں۔ لیکن آپ نے سختی کے ساتھ ان کی آواز دبا دی۔ اور اسی پر میں اپنی گفتگو ختم کرنا چاہتا ہوں، صرف ایک دو باتیں رہ گئی ہیں۔

بنو امیہ کے لوگوں نے جب دیکھا کہ ان کا احتجاج کسی صورت مؤثر ثابت نہیں ہو رہا، تو انھوں نے چپکے سے انھیں زہر دلوا دیا اور آپ اچانک بیمار ہو گئے۔ بیماری کے دوران میں آپ کو بنو امیہ کی اس حرکت کا علم ہوا تو آپ نے اس غلام کو اپنے پاس بلایا، جس کے ہاتھوں آپ کو زہر دلوایا گیا تھا۔ دریافت کرنے پر اس نے آپ کو بتایا کہ اس کام کے لیے مجھے دس ہزار دینار دیئے گئے۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم یہ سب رقم بیت المال میں جمع کرا دو اور یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ لوگ تمھاری بوٹیاں نوچ لیں گے۔ ۲۵ رجب ۱۰۱ھ کو حمص کے قریب ایک گاؤں میں آپ کا انتقال ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

تو بھئی یہ تھے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ـــ اب آپ کا کام یہ ہے کہ ان حالات کی روشنی میں گھر جا کر ایک اچھا سا مضمون لکھیے۔ لیجیے گھنٹی بج گئی ـ خدا حافظ!

رباعیات

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ ہُوا، ہُوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا
(ذوقؔ)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بُو تیری ہے
(میر انیسؔ)

ہو علم اگر نصیب، تعلیم بھی کر
دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو
جو اہل ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر
(اکبر الٰہ آبادی)

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بے کار
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں
(اکبر الٰہ آبادی)

عشرت کا ثمر تلخ [illegible] ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے
(مولانا حالی)

منزل پہ پہنچنا ہے تو چلنا سیکھو
گرنا تو ہے آسان، سنبھلنا سیکھو
حالات سے یہ تم پہ اُداسی کیوں ہے؟
ظلمت کو اُجالے میں بدلنا سیکھو
(اظہر قادری)

مشق

۱۔ اعراب لگائیے اور معنی لکھیے۔ ثمر۔ تلخ۔ قہقہہ۔ بلبل۔ بکا۔ منزل۔ تعظیم۔ جستجو۔

۲۔ آپ ان رباعیوں کو قدرے بلند آواز سے بار بار پڑھیے، آپ کو احساس ہوگا کہ یہ ایک ہی وزن میں لکھی ہوئی ہیں۔ اگر رباعی کو صحیح طریق سے پڑھنا آجائے تو اس سے بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ ابتدا میں پڑھنے والا ذرا اُلجھن محسوس کرتا ہے لیکن برابر مشق کرنے سے یہ اُلجھنیں دُور ہوجاتی ہیں۔ آپ مدرسے کی لائبریری سے رباعیوں کے مجموعے حاصل کرکے اپنے طور پر پڑھیے۔

واقعۂ کربلا

دنیا میں کچھ واقعات ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے انسانی تاریخ پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ کربلا کا واقعہ بھی تاریخ عالم کا وہ اہم واقعہ ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ یہ صبر و استقلال، حوصلے اور عزیمت کی داستان ہے۔ کربلا کے واقعات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ حق کا پرچم بلند رکھنے کے لیے خواہ کتنے ہی کٹھن مراحل سے گزرنا پڑے، جی نہیں ہارنا چاہیے۔ کربلا حق دوستی اور حق پرستی کی علامت ہے۔ امام حسینؑ نے اللہ کی راہ میں سب کچھ لٹا دیا مگر باطل کی قوتوں کے سامنے سر نہ جھکایا اور اس طرح شہادت کے بلند مرتبے پر فائز ہو کر زندۂ جاوید ہوگئے۔ کربلا کا واقعہ ۶۱ھ میں پیش آیا۔ مسلمان ہر سال اس عظیم واقعے کی یاد مناتے ہیں۔ آئیے آج ہم حق و باطل کے اِس معرکے کی خونچکاں داستان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۶۰ ہجری میں حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید بن معاویہ تخت نشین ہوا تو اس نے راتوں رات مختلف علاقوں کے گورنروں کی طرف قاصد دوڑائے اور ہر گورنر کو تاکید کی کہ لوگوں سے نئے خلیفہ کی بیعت لی جائے۔ خصوصاً مدینہ کے حاکم ولید کو تاکید تھی کہ وہ نواسۂ رسولؐ حسین ابن علیؓ سے بیعت لے۔ جب یہ پیغام حاکم مدینہ کے پاس پہنچا تو رات کا وقت تھا۔ ہر طرف گھری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اُس نے مناسب سمجھا کہ اسی وقت امام حسینؑ کو بلا کر بیعت طلب کی جائے۔ چنانچہ ایک آدمی امام حسینؑ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ جب امام دار الامارت میں پہنچے تو ولید نے امیر معاویہؓ کی وفات کی خبر سنا کر آپ سے یزید کی بیعت کرنے کو کہا۔ امام حسینؑ نے اس کام کی اہمیت کے پیشِ نظر ولید سے کہا کہ ابھی تو رات کا وقت ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں اس لیے صبح کی روشنی میں لوگوں کے سامنے مجھ سے گفتگو کرنا۔ ولید تو رضامند ہوگیا مگر ایک دُوسرے شخص نے کہا، "ولید! پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ یا تو حسینؑ اسی وقت بیعت کریں یا وہ قتل کیے جائیں۔" یہ سن کر امام کو جلال آگیا۔ آپ نے فرمایا، "کس کی مجال ہے جو مجھے قتل کرے۔" امام حسینؑ کی بلند آواز جب جوانانِ بنی ہاشم کے کانوں میں پڑی تو تلواریں سونت کر اندر آگئے لیکن امام انھیں سمجھا بجھا کر واپس لے گئے۔ جب آپ نے دیکھا کہ مدینہ میں رہ کر حالات کی اصلاح مشکل ہے تو حج کا قصد کیا، مکّہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ حج کے ایام تھے اور دُور دُور سے حجاج کے قافلے مکّہ میں آ رہے تھے۔ یزید نے سوچا کہ

کہیں مسلمان اصل صورت سے آگاہ ہو کر اُس کے خلاف نہ ہو جائیں، اس لیے اُس نے حاجیوں کے بھیس میں امام حسینؓ کو قتل کرنے کے لیے آدمی بھیجے۔ جب امام کو اس بات کا علم ہُوا تو آپ نے مکہ مکرمہ کی حرمت اور عظمت کا پاس کرتے ہوئے اس شہر کو بھی چھوڑ دیا اور عراق کا رُخ کیا کیونکہ اہل کوفہ کے بے شمار خطوط آچکے تھے اور آپ اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر کوفہ بھیج بھی چکے تھے۔

جب امام منزل ثعلبیہ پر پہنچے تو آپ کو ایک قاصد نے حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت کی المناک خبر پہنچائی۔ آپ دیر تک اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتے رہے اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "اُن کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں"۔

لوگوں کی ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ ہو گئی تھی۔ آپ نے سب کو جمع کر کے فرمایا۔ "لوگو! ہانی بن عروہ، مسلم بن عقیل اور عبداللہ بن یقطر قتل کر دیے گئے۔ جو ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہے چھوڑ دے۔ ہم ہرگز خفا نہیں ہوں گے"۔ بھیڑ نے یہ سُنا تو دائیں بائیں کٹنا شروع ہو گئی۔

قادسیہ سے کچھ آگے بڑھے تو حُر ابن یزید ریاحی ایک ہزار فوج کے ساتھ نمودار ہُوا۔ اُسے حکم ملا تھا کہ حضرت امام حسینؓ کا راستہ روک کر انھیں کسی طرح ابن زیاد کے پاس لے آئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ صحرا کا ذرہ ذرہ تپ رہا تھا۔ حُر کے سپاہی اور گھوڑے پیاس سے ہلکان ہو رہے تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے انھیں پانی پلایا جائے۔ مشکیں کھول دی گئیں اور سب نے سیر ہو کر پانی پیا۔ حُر نے کہا، "یا تو آپ ابن زیاد کے پاس چلیں یا ایسا راستہ اختیار کریں جو نہ مدینہ کی طرف جاتا ہو اور نہ کوفہ کی طرف اور یہ حالت اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک عبیداللہ ابن زیاد کی طرف سے کوئی تازہ ہدایت نہ آجائے"۔ چنانچہ امام حسینؓ نے اپنا سفر جاری رکھا اور دو محرم ۶۱ھ کو آپ کربلا پہنچ گئے اور آپ کے خیام فرات کے کنارے نصب کر دیے گئے۔

ادھر عبیداللہ ابن زیاد نے عمر بن سعد کو لشکر کا سالار بنا کر کربلا کی طرف روانہ کر دیا اور اُسے تاکید کی کہ امام حسینؓ پر فوراً پانی بند کر دیا جائے اور ان کا سر کاٹ کر میرے پاس لایا جائے۔ عمر ابن سعد چھ ہزار سواروں کے ساتھ ۳ محرم کو کربلا میں وارد ہُوا اور حضرت امام حسینؓ کے خیموں کے پاس پڑاؤ ڈال دیا۔ اسی اثنا میں ابن زیاد حاکم کوفہ نے عمر بن سعد کو خط لکھا کہ جہاں تک ہو سکے خیامِ امام تک پانی کی رَسد نہ پہنچ سکے اور اس غرض سے دریائے فرات پر محافظین کا پہرہ سخت کر دیا جائے۔ چنانچہ سات محرم کو امام حسینؓ اور ان کے ہمراہیوں پر پانی بند کر دیا گیا۔ گرمی کے دن تھے اور صحرا کی تپش تھی۔ آٹھ محرم کی رات ہوتے ہی بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کی حالت غیر ہو گئی۔ چنانچہ حضرت عباسؓ نے جو حضرت امام حسینؓ کے بھائی

تھے۔ پے درپے دو کنوئیں کھودے مگر دونوں پانی سے خالی نظر آئے۔ امام حسینؑ نے عمر ابن سعد کو بلا کر کہا، "خدا سے ڈر اور میرے ساتھ مقابلہ نہ کر۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میں کس کا فرزند ہوں۔" ابن سعد نے کہا، "ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں ابن زیاد میرا گھر کھدوا ڈالے گا اور میری تمام جائیداد ضبط کر لے گا۔" جب امام حسینؑ کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ نہیں مانے گا تو آپ نے اپنے تمام جاں نثار ساتھیوں کو بلا کر خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا۔

"پروردگارِ عالم تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے دلِ دانا، چشمِ بینا اور گوشِ حق نیوش مرحمت کیے۔ پس ہم کو شکر کرنے والوں کی جماعت میں شمار فرما۔ اے لوگو! مجھے زمانے کے انداز بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس لیے میں تم سے تمام عہد و پیمان اٹھائے لیتا ہوں اور تم کو اجازت دیتا ہوں کہ تمھارا جس طرف جی چاہے نکل جاؤ۔ یہ رات ہے اور ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ تم میں سے ہر شخص اس سیاہ رات میں مختلف شہروں اور قصبوں میں چلا جائے کیوں کہ یہ لوگ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ جب مجھ کو پا لیں گے تو تم سے تعرض نہ کریں گے۔" یہ کہہ کر امام نے چراغ گل کر دیا تاکہ کسی کو جاتے وقت ندامت نہ ہو اور جب آپ نے دوبارہ چراغ روشن کیا تو آپ کے جاں نثاروں نے کہا۔ "اگر ہم کو ہزار بار جلایا اور زندہ کیا جائے تو بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔" اسی وقت شمر ذی الجوشن بھی ایک لشکر کے ساتھ پہنچا جو اپنے ساتھ حضرت عباسؓ اور ان کے تینوں بھائیوں عبد اللہ، جعفر اور عثمان کے لیے ابن زیاد کی طرف سے امان لکھوا کر لایا تھا۔ جب اس نے میدان میں چاروں کو بلا کر کہا، "تم میرے بھانجے ہو۔ تمھارے لیے میں نے امن اور سلامتی کا سامان کر لیا ہے۔" لیکن انھوں نے جواب دیا۔ "ہمیں تمھارے امان نامے کی ضرورت نہیں۔ افسوس تم پر، تم ہمیں تو امان دیتے ہو لیکن فرزندِ رسول اللہؐ کے لیے امان نہیں ہے۔"

نو محرم کی رات اصحابِ حسینؑ نے عبادت میں گذاری۔ نویں کا دن طلوع ہوا تو امام نے اپنے اصحاب و انصار کے ساتھ صبح کی نماز ادا فرمائی۔ ادھر سپاہِ شام نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ آپ نے حضرت عباسؓ کو بھیج کر عمر بن سعد سے کہا کہ آج کی رات مجھے عبادت اور استغفار کر لینے دو، کل دیکھا جائے گا۔ عمر بن سعد اس پر رضامند ہو گیا اور فریقین اپنے اپنے خیموں میں واپس چلے گئے۔

شبِ عاشور آئی۔ رات آپ کے اہلِ بیت اور اصحاب نے نماز اور قرآن کی تلاوت میں گذاری۔ آپ کے خیموں سے تسبیح کی آوازیں ایسی آتی تھیں جیسے شہد کی مکھیوں کی آوازیں ہوتی ہیں۔ یہ رات آلِ محمدؐ کے لیے قیامت کی رات تھی۔ بچے پیاس کی شدت سے بلبلا رہے

تھے اور خیامِ حسینی سے العطش العطش کی صدائیں آ رہی تھیں۔

جمعہ کے دن دسویں محرم کو نماز فجر کے بعد عمر بن سعد اپنی فوج کو لے کر نکلا۔ حضرت حسینؓ نے بھی اپنے اصحاب کی صفیں درست کیں۔ آپ کے ساتھ ۳۲ سوار اور ۴۰ پیدل کل ۷۲ آدمی تھے۔ علم اپنے بھائی حضرت عباسؓ کو دیا۔ خیموں کے پیچھے خندق کھود کر بہت سا ایندھن ڈھیر کر دیا گیا تاکہ دشمن خیام پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ دشمن کا رسالہ آگے بڑھا، تو آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے "الٰہی! ہر مصیبت میں تجھی پر میرا بھروسہ ہے۔ ہر سختی میں میرا تو ہی پشت پناہ ہے۔ تو ہی احسان کرنے والا ہے۔ آج بھی تجھ سے مدد کی التجا کرتا ہوں۔" اس کے بعد آپ نے یزیدی افواج کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"لوگو! میرا حسب و نسب یاد کرو۔ کیا میں تمھارے نبیؐ کی بیٹی کا بیٹا اور اُن کے چچا زاد کا بیٹا نہیں ہوں۔ کیا حمزہؓ میرے باپ کے چچا نہ تھے؟ کیا جعفر طیار میرے چچا نہیں ہیں؟ واللہ اس روئے زمین پر میرے سوا کسی نبی کی بیٹی کا لختِ جگر موجود نہیں تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟ کیا میں نے کسی کی جان لی ہے؟ کسی کا مال چھینا ہے؟ آخر میرا قصور کیا ہے؟"

یہ سُن کر حُر ابن یزید ریاحی گھوڑے کو ایڑ لگا کر لشکرِ حسینؓ میں پہنچ گیا۔ راستے میں کسی نے پوچھا۔ کہاں جاتے ہو؟ تو حُر نے جواب دیا۔ "بخدا میں نے جنت کا انتخاب کر لیا ہے اور حسینؓ کی طرف جا رہا ہوں۔"

جنگ شروع ہوئی۔ اعوان و انصار، عزیز و اقارب شہید ہوتے گئے، حسینؓ لاش پر لاش اُٹھاتے رہے۔ جوان بیٹے علی اکبر اور بھتیجے قاسم کی لاش اٹھائی۔ بھائی عباسؓ اور آخر میں چھ ماہ کے علی اصغر کی لاش خیمے تک لائے۔ اب آپ کا ہر طرف سے نرغہ شروع ہوا۔ چار جانب سے فوجوں نے جب ہجوم کیا تو آپ ان پر اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح عقاب پرندوں پر جھپٹتا ہے مگر ایک تیر ایسا آکر لگا کہ آپ گھوڑے کی زین پر سنبھل نہ سکے۔ اور زمین پر آ رہے۔ عمر ابن سعد نے تمام فوج کو حکم دیا کہ بہت جلد آپ کو قتل کر دیا جائے۔ شمر ذی الجوشن آگے بڑھا اور آپ کو اُس وقت شہید کر ڈالا جب آپ نمازِ عصر پڑھتے ہوئے خدا کے حضور سربسجود تھے۔ آپ کے خیمے جلا دیے گئے اور لاش گھوڑوں سے پامال کرائی گئی۔ دُوسرے دن عمر ابن سعد شہدائے کربلا کے بہتّر سر اور اہل بیت کو قیدی بنا کر کوفہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مشق

۱۔ کربلا کے واقعات سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟ ۲۔ واقعۂ کربلا کو اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
۳۔ اِس سبق سے حروفِ ربط تلاش کیجیے اور انھیں اپنی کاپی میں لکھیے۔

خطوط

مرزا غالب کے خط ـــــ دوستوں کے نام

(۱)

کیوں صاحب! روٹھے ہی رہوگے یا کبھی منوگے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو رُوٹھنے کی وجہ لکھو۔ میں اِس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص خود تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف وجوانب سے دو چار خط نہ آرہے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دِل لگی ہو جاتی ہے۔ اِن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں وقت گذر جاتا ہے۔ کیا سبب کہ دس بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب! نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

غالبؔ

سوموار۔ ۷ دسمبر ۱۸۵۷ء

(۲)

بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہوگیا۔ یعنی منگل کے دِن ۱۸ ربیع الاوّل کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اُس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھی تھی، مر گئی! آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھوپھیاں، تین چچا اور ایک باپ، ایک دادی اور ایک دادا۔ یعنی اِس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اِس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یک بار مر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

خواجہ حسن نظامی کا خط ـــــ اپنی بیٹی کے نام

حورا خانم! ذرا لینا، اِس خط کو جلدی سے پڑھ لو۔ پھر تم کو کھیل سے فرصت نہ ملے گی اور میں اپنے کام میں لگ جاؤں گا۔

بیٹی! اگر میں یہ سنوں کہ تم نے لکھنا ناغہ نہیں کیا تو جی کیسا باغ باغ ہو۔ مگر یہ اُمید کہاں ہے! جب تک میں تقاضا نہ کروں، تم کب خیال کرتی ہو۔ پڑھو تو اپنے شوق سے پڑھو، لکھو تو اپنے شوق سے لکھو۔ اب تم بارہ برس کی ہوئیں۔ وہ وقت قریب آ گیا ہے کہ تم پرائے گھر کی ہو گی۔ کچھ لیاقت نہ ہوئی تو ناک کٹ جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ لکھنے پڑھنے والے باپ کی اکلوتی بیٹی اور قابلیت خاک نہیں۔ میرا کچھ بھی نہیں بگڑے گا جی تمہارا جلے گا۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے ہر وقت سینے پرونے، کھانے پکانے، لکھنے پڑھنے میں دھیان رکھو۔ کھیل تماشے کا زمانہ ختم ہوا، اب اور وقت آ رہا ہے۔ اری بنّو، ذرا سمجھ تو سہی میں نے کیا کہا، اس میں میری غرض کچھ نہیں ہے، جو ہے تیرے فائدے کی بات ہے۔

سب کو آداب وسلام۔ تمہارا خیر خواہ باپ

حسن نظامی

مولوی نذیر احمد کے خطوط ـــــ اپنے بیٹے کے نام

(۱)

بشیر! خدا کے لیے اب پورا پورا شوق کرو۔ دو تین برس کی محنت ہے۔ بڑا مرحلہ انٹرنس کا ہے، اگر تم اس میں کامیاب ہوئے تو یہ کامیابی اگلے امتحانوں میں تمہاری مددگار ہوگی۔

عِلم تو سب طرح کے ہیں، اور طالب علم کو لازم ہے کہ سب کی طرف برابر توجہ دے۔ لیکن سب سے مقدم ادب ہے جس کو انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں یعنی زبان دانی۔ کمالِ زبان دانی یہ ہے کہ تم کو اہلِ زبان کی سی قدرت حاصل ہو۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ زبان دانوں کی عبارتیں یاد ہوں۔ جس طرح کے خیال اور مضمون کو، جس پیرائے میں اہلِ زبان نے ادا کیا ہے اس کی تقلید، اس کو نقل کرنی چاہیے۔ غرض زبان دانی کے لیے یادداشت شرط ہے۔ محاورات اور امثال وحکایات اور لغت اور جملوں کا استعمال جنھیں پر سپورشن کہا جاتا ہے، سب پیشِ نظر رہیں۔ جس تحقیق سے تم مجھ سے عربی پڑھتے تھے کہ ہر ہر لفظ کا مادہ اور ماخذ اور صیغہ اور ترکیب کوئی بات چھوٹنے نہ پاتی تھی۔ یہی تحقیق فارسی اور انگریزی کی زبانوں میں ہے۔ جس کسی کتاب کا لفظ لے کے بیٹھو، خود لفظ لفظ پر نظر کرتے جاؤ۔ جب اس انضباط سے دو چار کتابیں نکلیں، اچھی خاصی استعداد ہو جائے گی۔ زبان دانی کی استعداد بے شک کتابوں کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے مگر اہلِ زبان سے گفتگو کرنا بھی ایک عمدہ ذریعہ

ہے۔ اس واسطے میں نے تم کو مدرسے میں چھوڑا ہے۔ جہاں تک ہو سکے بُری، بھلی، غلط صحیح ٹوٹی ہوئی انگریزی بولنی چاہیے۔ تمہاری جماعت میں شاید اکثر کو انگریزی بولنے کی مہارت ہو اور تم اونچی کلاس کے لڑکوں سے تعارف پیدا کرو اور ہر روز تین چار گھنٹے انگریزی میں بات چیت کرو تاکہ جھجک اور رکاوٹ دور ہو۔

روز کا کام روز کرنا ضرور ہے۔ جو سبق پڑھا، اچھی طرح سمجھ کر اُس کو قابو میں کو لیا۔ غافل لڑکے سبق جمع کرتے جاتے ہیں اور امتحانوں کے زمانے میں انبارِ مصیبت ہو جاتا ہے۔ ایک نقشہ اس طرح کا بنا لو اور اس کو خوش خط کاغذ پر لکھ کر اپنی میز کے سامنے لگا دو۔ اس سے تم کو معلوم ہوگا کہ کس وقت کیا کرنا ہے۔

دن کا نام	پہلا گھنٹہ	دُوسرا گھنٹہ	تیسرا گھنٹہ
شنبہ	عربی	اُقلیدس	فارسی
یک شنبہ	جبر و مقابلہ	حساب	انگریزی ادب

مدرسے کے خالی گھنٹے اور فرصت کے اوقات انگریزی گفتگو میں شریک کرو۔ تفریح کی تفریح اور فائدے کا فائدہ۔ اسی طرح اپنے باہر کے اوقات منضبط کر لو کہ فلاں وقت پر فلاں کام کریں گے۔ اور جب اپنے کُل اوقات منضبط کر چکو، مجھ کو بھی اطلاع کر دو۔ اس انتظام میں اس کا بڑا خیال رکھو، طبیعت پر اتنا بوجھ نہ پڑنے پائے کہ گھبرا جائے۔ جب خوش دلی ہو سب کام اچھا ہوتا ہے۔ بے دلی پیدا ہوئی اور کام بگڑا۔ اس کو پیشِ نظر رکھو کہ تم کو اِس سال دوسری جماعت میں ترقی کر کے جانا ہے اور امتحان سالانہ وہیں دینا ہے۔ بس وہاں کا کورس ابھی سے رفتہ رفتہ اپنے بس میں لانا چاہیے۔ تم مجھ سے وقتاً فوقتاً ہر بات اور ہر مسئلہ پوچھتے رہو۔ جہاں تک ممکن ہے میں یہیں سے تم کو سمجھا دوں گا۔

(۳)

جس وقت سے میں آیا تھا تمہارا اسباب جمع کرنے کی فکر میں تھا۔ چنانچہ اِس وقت اسباب صندوق میں جمع کر کے اُوپر سے ٹاٹ مڑھ کو بکسہ روانہ کرتا ہوں۔ وہاں سے ریل پر روانہ ہو جائے گا۔ اس ایک صندوق میں اتنی کتابیں ہیں کہ اگر آدمی نظرِ تحقیق سے ان پر عبُور حاصل کر لے تو عالم ہو جائے مگر رکھ چھوڑنے کو کتاب اور پتھر برابر ہے۔ مقدّم جماعت کی پڑھائی ہے۔ اس کے یاد کرنے سے جو وقت بچے اُس میں دُوسرا کام کرنا چاہیے۔ اِس قدر بوجھ اپنے اوپر مت ڈالو کہ جماعت میں بُرے رہو، کیونکہ ہم سبقوں میں پیچھے رہنا بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ بڑا انتظام اس کا ہے کہ انگریزی بول چال اور عبارتِ انگریزی کے لکھنے میں

یعنی انگریزی کمپوزیشن میں ترقی ہو۔ سو اُمید ہے کہ اِس کے لیے تم نے تدبیر مناسب کرلی ہوگی۔ اگر وقت کو انتظام سے صرف کرو اور معمول باندھ کر ہر کام وقت پر کرتے رہو، تو بافراغت جماعت کی پڑھائی بھی بخوبی یاد کرلوگے، اور پھر بھی اتنا وقت بچے گا کہ اُس میں انگریزی کو بڑھاؤ، عربی پڑھو اور اُونچی کلاس میں جانے کا حوصلہ رکھو۔

(نمبر ۳)

بشیر! بچپن میں تمہارا زیادہ وقت خدمت گاروں میں بسر ہوتا تھا چونکہ یہ لوگ تمہیں کھلاتے بھرتے تھے۔ ایک دن میں نے تم سے کہا کہ میاں بشیر تم نوکروں میں رہ کر گالیاں بکنی، قسم کھانی اور جھوٹ بولنا سیکھ گئے تو تمہارا منہ سڑ جائے گا اور میں تم کو اپنے ساتھ نہیں سلاؤں گا۔ بچے معصوم، تم کو میرے کہنے کا یقین ہو گیا۔ ایک دن تمہاری زبان سے کوئی بے ہودہ بات نکلی تو تم کو میرا مقولہ یاد آیا تو بھاگے ہوئے اپنی والدہ کے پاس گئے کہ اماں بی ذرا منہ سونگھنا۔ ان کو میری نصیحت کا حال معلوم تھا، سمجھ گئیں اور بولیں۔ "سونگھ کر کیا کروں گی گالیوں کی بُو آرہی ہے" یہ سُن کر تم بہت گھبرائے۔ آخرکار انہوں نے توبہ کرادی اور الائچی کے دانے چبوائے۔ تب تم کو تسلی ہوئی۔ لیکن بہت دنوں تک تم اس بدبُو کے ڈر سے احتیاط کرتے رہے اور شکر ہے کہ تمہاری زبان گالی سے آشنا نہیں ہوئی۔

نذیر احمد

علامہ اقبالؒ کا خط ــــ شاد عظیم آبادی کے نام

مخدومی، تسلیم۔

آپ کا والانامہ مجھے ابھی مِلا ہے۔ اِس غائبانہ عقیدت کی وجہ سے جو آپ سے ہے یہ معلوم کرکے بڑی مسرّت ہوئی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمہ وجوہ، خیر و عافیت سے ہیں اور باوجود پیرانہ سالی کے لِٹریری مصروفیتیں کم نہیں ہوئیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تصانیف تمام ملک کے لیے مفید ہوں گی اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی تکمیل کے لیے دیر تک سلامت رکھے۔ جس تمدّنی نظام نے آپ کو پیدا کیا وہ تو اب رُخصت ہو رہا ہے بلکہ ہو چکا ہے لیکن آپ کی ہمہ گیر دماغی قابلیّت اور اس کے گراں بہا نتائج اِس ملک کو ہمیشہ یاد دلاتے رہیں گے کہ موجودہ نظامِ تمدّن پرانے نظام کا نعم البدل نہیں ہے۔ کاش عظیم آباد قریب ہوتا اور مجھے آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا۔ شیخ عبدالقادر صاحب مع الخیر ہیں۔ اور خدا کے فضل و کرم سے بہت سے بال بچے ہیں۔ تھوڑے

عرصے کے لیے ہائی کورٹ لاہور کے جج بھی ہو گئے تھے مگر اب پریکٹس کرتے ہیں۔ آج کل لاہور سے باہر ہیں۔ انشاء اللہ جب اُن سے ملاقات ہوگی آپ کا سلام اُن تک پہنچا دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی خیریت سُن کر وہ بھی میری طرح بے انتہا مسرُور ہوں گے۔

اُمید ہے کہ جناب کا مزاج اچھا ہوگا۔

مخلص محمد اقبال لاہور

بابائے اُردُو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا خط — ایک نیاز مند کے نام

مکرمی، تسلیم

آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ اِس ماہ کے آخر میں ایک ادبی نمائش کا انعقاد کر رہے ہیں۔ آپ کی انجمن نہایت مفید کام کر رہی ہے۔ میرے دل میں اِس کی بہت قدر ہے۔ کاش دُوسرے مقامات پر بھی اس قسم کی انجمنیں قائم ہوں اور جو کام آپ کر رہے ہیں اُس سے سبق حاصل کریں۔ آپ کی ادبی نمائش کا بہت اچھا اثر ہوگا۔ اُردو زبان کے حق میں بہت مفید ہوگی۔ اس میں جہاں تک ممکن ہو میسُور کے اُردو ادب کو خاص طور پر پیش کیا جائے۔ آپ کو مخطوطات اور مطبوعات کی صُورت میں کافی سامان مِل جائے گا۔ عام طور پر لوگ ابھی پورے طور پر واقف نہیں کہ میسُور نے اردو زبان کی کیا خدمت کی ہے۔ اس نمائش میں اس کے اظہار کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ مجاہدِ اعظم سلطان ٹیپو کی فوجی اُردو اصطلاحات اور اشعار ضرور پیش کیے جائیں۔ اِس قسم کی نمائشیں ادبی ذوق اور علمی معلومات کے لیے بہت ممد ہوتی ہیں۔ میں اِس کی کامیابی اور تفصیلی حالات سُننے کا متمنی رہوں گا۔ آپ نے جو اشیا طلب کی ہیں ان کے بھیجنے کا انتظام کر رہا ہوں۔

عبدالحق

مشق

۱۔ مرزا غالبؔ کے خطوط کی خاص باتیں بیان کریں۔

۲۔ خواجہ حسن نظامی کی خطوط نویسی کے بارے میں اظہارِ خیال کیجیے۔

۳۔ مولوی نذیر احمد کے خطوط میں آپ کو جو باتیں سب سے زیادہ پسند آئیں، اُنھیں خوش خط لکھیں۔

۴۔ خط لکھنے کا عمدہ طریقہ کیا ہے؟

آبادی کے مسائل

پچھلے ہفتے مجھے اپنے پُرانے مدرسے میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ میں اس مدرسے میں آج سے پچیس تیس برس قبل پڑھا کرتا تھا۔ لیکن یہاں سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کر کے ایسا گیا کہ اس مدرسے میں تو کیا اس شہر میں بھی واپس نہ آسکا۔ اب جو ایک طویل مدّت کے بعد مدرسے کے دروازے پر پہنچا تو ایک عجیب نقشہ نظر آیا۔ وہ مدرسہ جو کبھی شہر سے ایک میل دُور سرسبز و شاداب کھیتوں کے وسط میں واقع تھا اب بلند و بالا عمارتوں میں گھِر چکا ہے۔ جس علاقے میں کبھی آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا اب وہاں لوگ ہی لوگ تھے۔ مدرسے کے سامنے دکانیں تھیں اور اس کے پیچھے مکانات بنے ہوئے تھے۔

مدرسے کے اندر داخل ہُوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مدرسے کا حُلیہ ہی بدل چکا ہے۔ وہ عمارت جو کبھی دس بارہ کمروں پر مشتمل تھی اب وہاں کمرے ہی کمرے تھے۔ یہاں تک کہ کھیل کا وہ وسیع و عریض میدان جہاں ہم ہاکی اور فٹ بال کھیلا کرتے تھے، کمروں، تجربہ گاہوں اور ورکشاپوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مدرسے میں ایک صحن البتہ باقی تھا لیکن اتنا چھوٹا کہ طلبہ بمشکل صبح کی دعا کے لیے وہاں جمع ہو سکتے تھے۔

میں نے مدرسے کی پرانی عمارت میں اپنی جماعت کا کمرہ پہچاننے کی کوشش کی لیکن ٹھیک سے شناخت نہ کر سکا۔ شاید اس لیے کہ کمروں کے ارد گرد کے تمام برآمدے بھی کمروں ہی میں تبدیل ہو چکے تھے۔ خیر مجھے ایک کمرے پر اپنی دسویں جماعت کے کمرے کا گمان ہُوا۔ میں نے فرطِ اشتیاق سے کھڑکی میں سے اندر جھانکا تو دماغ چکرا گیا۔ جس کمرے میں کبھی تیس پینتیس طلبہ بیٹھا کرتے تھے اب وہاں ستر اسّی لڑکے موجود تھے۔ ایک ایک ڈیسک پر چار چار طلبہ اور ہر ڈیسک دُوسرے سے یُوں ملا ہُوا کہ استاد کے لیے کمرۂ جماعت میں گھومنا بھی ممکن نہ تھا۔

یہاں میری آمد کا مقصد اپنی اس عظیم درس گاہ کو سلام پیش کرنا تھا کیونکہ میری ترقی اور شہرت میں اس مادرِ علمی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ میں اس کے قدموں میں عقیدت کے پھول نچھاور کرنے آیا تھا۔ مجھے یہاں کے در و دیوار سے محبّت تھی۔ مجھے یہاں کی ایک ایک اینٹ سے پیار تھا۔ میں مدرسے میں تیزی سے گھومنے لگا، اور جس قدر تیزی سے میں گھوم رہا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار سے میرے ذہن میں خیالات کی گردش کا سلسلہ جاری تھا۔ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے

تیس سال قبل کا وہ مدرسہ تھا جہاں ہم تین سو طلبہ یوں زیرِ تعلیم تھے جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ ہر اُستاد ہر طالب علم کو جانتا تھا اور مدرسے کا ہر طالب علم دوسرے ہر طالب علم کو نہ صرف شکل سے پہچانتا تھا بلکہ اُسے نام سے پکارتا تھا۔ کشادہ اور ہوادار کمروں کے اردگرد کھلے کھلے برآمدے اور برآمدوں کے آگے وسیع میدان۔ مدرسے میں پہنچتے تو دِل کا کنول کھِل جاتا تھا۔ ہر طالب علم اُستاد کی توجہ کا مرکز اور ہر اُستاد طالب علم کے لیے مجسمۂ شفقت! تعلیم ہمارے لیے وجۂ سکون اور باعثِ فرحت و انبساط تھی۔

میرے ذہن میں مختلف نقوش اُبھرتے، چند چہرے سامنے آتے اور محو ہو جاتے اور پھر اُن کی جگہ نئی شکلیں لے لیتیں۔ میرے تمام اساتذہ کرام ماضی کے دھندلکوں میں سے ایک ایک کرکے سورج کی کرنوں کی طرح ابھرتے اور میرے دل کو گدگداتے ہوئے ماضی کے پردوں میں چھپتے چلے گئے۔ میں انھی خیالات میں کھویا ہُوا تھا کہ گھنٹی کی ٹن ٹن نے مجھے چونکا دیا۔ گھنٹی کا بجنا تھا کہ مدرسے کے چاروں طرف سے لڑکوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا۔ کچھ طلبہ پانی کے لیے برآمدے میں رکھے ہوئے مٹکوں کی طرف لپکے، کچھ کینٹین کی جانب بھاگے، اور بہت سے لڑکے مدرسے کے صدر دروازے کے باہر کھڑے چھابڑی والوں کے گرد جمع ہو گئے۔ میں نے ایک لڑکے سے پوچھا۔ اس مدرسے میں طلبہ کی تعداد کیا ہے؟ — جواب ملا کہ تین ہزار! یہ تعداد سن کر مجھے چکر سا آ گیا! اس لیے نہیں کہ یہ ڈھیر سارے طلبہ تعلیم کیوں حاصل کر رہے ہیں بلکہ اس لیے کہ وسائل اور سہولتوں کے لحاظ سے اس مدرسے میں تین ہزار طلبہ کی تعلیم کی گنجائش ہرگز موجود نہ تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر طلبہ کو تعلیم کی مناسب سہولتیں نہ ملیں تو اس کا اثر معیارِ تعلیم پر پڑے گا۔ اور اگر تعلیم کا معیار گِر گیا تو اس سے زندگی کے تمام شعبے متأثر ہوں گے۔ میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ ایک دفعہ پھر گھنٹی بجی اور لڑکے اپنی اپنی جماعتوں میں چلے گئے۔ یوں لگا جیسے متلاطم سمندر میں یک دم سکون آ گیا ہو۔

مجھے مدرسے میں آئے ہوئے کوئی دو ڈھائی گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے اس کے در و دیوار کی جی بھر کے زیارت کر لی تھی۔ اب میں واپس جانے ہی کو تھا کہ میری نظر سامنے ایک مانوس چہرے پر پڑی۔ روشن چہرہ، کھچڑی ڈاڑھی، رعب دار شکل، سر پہ جناح کیپ اور ہاتھ میں چھڑی! غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ یہ میرے استادِ محترم جناب عبد القادر تھے۔ فوراً آگے بڑھا اور جھک کر انھیں سلام کیا۔ پہلے تو انھوں نے مجھے نہ پہچانا لیکن جب میں نے اپنا نام بتایا تو فوراً پہچان گئے۔ مجھے گلے سے لگایا اور اپنے ساتھ دفتر میں لے گئے۔ آج کل وہی اس مدرسے کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان سے مل کر عہدِ رفتہ کی سب یادیں تازہ ہو گئیں۔ اپنے محترم اساتذہ اور ہم سبقوں کے متعلق دیر تک ان سے گفتگو ہوتی رہی۔

دورانِ گفتگو میں نے اپنے وقت کے مدرسے اور آج کے مدرسے میں نمایاں تفاوت پر حیرت کا اظہار کیا تو فرمانے لگے ۔ "امجد تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن یہ بھی تو سوچو کہ جو مدرسہ صرف تین سو طلبہ کے لیے بنا تھا اب وہاں تین ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ بلاشبہ کمروں، فرنیچر اور اساتذہ کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے لیکن باقی سہولتیں بڑھنے کے بجائے گھٹی ہیں۔ بچے کھیل کود کے میدان سے محروم ہوگئے ہیں۔ اب انھیں اساتذہ کی وہ خصوصی توجہ نہیں ملتی جو تمہارے زمانے میں ہر طالب علم کا حصّہ تھی۔"

میں نے عرض کیا ۔ "اگر مدرسے میں، مناسب سہولتوں کا فقدان ہے تو آپ اپنے مدرسے میں اتنے بچّے داخل کیوں کرتے ہیں؟" فرمانے لگے "اگر میں انھیں داخل نہ کروں تو یہ بیچارے کہاں مارے مارے پھریں؟ ذرا مدرسے سے باہر نظر اٹھا کر تو دیکھو ہر طرف آبادی ہی آبادی ہے۔ کیا تمہارے زمانے میں بھی یہ کیفیت تھی؟ میں نے عرض کیا ۔ "ہرگز نہیں یہاں تو ہرے بھرے کھیت ہوا کرتے تھے"۔ فرمانے لگے "اب کھیتوں کی جگہ مکانوں نے لے لی ہے اور پھر ایک ایک مکان میں دو دو تین تین خاندان آباد ہیں اور ہر خاندان میں پانچ سات بچے تو ضرور ہوں گے۔ پہلے تو یہاں ایک یہی مدرسہ تھا اب یہاں حکومت نے دو ہائی سکول اور بھی کھول دیے ہیں اور ہر مدرسہ ٹھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ لیکن ہمارے مدرسے پر پرانی شہرت اور تمہارے وقت کی عظیم روایات کے سبب داخلے کا دباؤ کچھ زیادہ ہی رہتا ہے۔ اور یوں بھی بچوں کو داخلے سے انکار کرتے ہوئے دُکھ محسوس ہوتا ہے۔ تعلیم تو ہر بچّے کا بنیادی حق ہے۔ جو بچّے آج تعلیم سے بے بہرہ رہیں گے کل کو وہی ملک اور معاشرے پر بوجھ بنیں گے۔ تمہارے زمانے میں اس شہر کی آبادی پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی، اب اس کی آبادی پانچ لاکھ سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ میں نے پوچھا۔ ایسا کیونکر ہوا؟ فرمانے لگے، کچھ تو ظاہر ہے پیدائش کی وجہ سے لیکن زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس شہر میں یکے بعد دیگرے بہت سے کارخانے لگتے رہے اور ارد گرد کے دیہات سے لوگ کارخانوں میں ملازمت کے شوق میں اس شہر کا رُخ کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ یہ شہر دیہات سے آئے ہوئے لوگوں سے بھر گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اکثر و بیشتر کارندوں نے شہر کے باہر جہاں جگہ ملی اپنی جھونپڑی بنا لی۔ ہوتے ہوتے یہی جھونپڑیاں مکانوں اور بستیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ چونکہ یہ بستیاں کسی منصوبہ بندی کے بغیر ظہور میں آئی تھیں اس لیے یہاں زندگی کی ضروری سہولتیں مہیّا نہ ہو سکیں۔ ان بستیوں کے مکینوں کو اب کئی مسائل کا سامنا ہے۔ پینے کا صاف پانی انھیں میسّر نہیں، گندے پانی کے نکاس کا انتظام یہاں موجود نہیں۔ بارش ہو جائے تو یہ بستیاں جزیروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مکھی اور مچھر یہاں خوب پرورش پاتے

ہیں جن کی وجہ سے ملیریا اور ہیضے کا خدشہ دائم رہتا ہے۔ اور اگر یہاں کوئی وبا پھوٹ نکلے تو پورا شہر ان کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ ان آبادیوں کے لوگوں میں تعلیم کی کمی ہے، اور جہاں تعلیم کی کمی ہو وہاں لوگوں کو یہ شعور بھی نہیں ہوتا کہ ان کے مسائل کی ایک وجہ آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہے۔"

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔" امجد! اگر موقع ملے تو ان آبادیوں میں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کہ آبادی میں بے ہنگم اضافے کے باعث تمہارا یہ پرانا شہر اب کن کن مسائل سے دوچار ہے۔ یہاں کی میونسپل کمیٹی اور حکومت کی پوری توجہ کے باوجود شہر کے وسائل اور سہولتوں میں اتنا اضافہ نہیں ہوا جتنا کہ آبادی میں ہوا ہے۔ گاڑیوں کی تعداد اتنی ہے کہ سڑکیں تنگ ہو گئی ہیں۔ پہلے ایک ہسپتال تھا اور مریضوں کو داخلے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ اب تین چار ہسپتال ہیں لیکن علاج معالجے میں جو دشواری اب ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ شہر میں کئی نئے مدرسے کھل چکے ہیں لیکن پھر بھی سینکڑوں بچوں کو داخلہ نہیں ملتا۔ حکومت یہاں کے لوگوں کی مدد کر رہی ہے۔ کچی آبادیوں میں پکی گلیاں اور نالیاں بنائی جا رہی ہیں۔ بجلی مہیا کر دی گئی ہے۔ اس کے باوجود ان بستیوں کی ہیئت تو نہیں بدلی جا سکتی۔ کاش یہ شروع ہی میں کسی منصوبے کے تحت بنتیں۔"

میں نے عرض کیا آپ سو فی صد درست فرما رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے بلکہ ہماری پوری زندگی میں منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔ اگر یہ سب کارخانے ایک ہی شہر میں لگنے کے بجائے کئی چھوٹے چھوٹے شہروں میں پھیلا دیے جاتے تو اس شہر پر آبادی کا دباؤ اتنا شدید نہ ہوتا۔

میں نے سوچا اس شہر کے مسائل میں یہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا بڑا ہاتھ ہے مجھے وحشت سی ہونے لگی کہ اگر اس شہر کی آبادی یونہی بڑھتی رہی تو چند ہی سال میں اس کی آبادی دگنی ہو جائے گی لیکن یہ تو ممکن نہ ہو گا کہ اس عرصے میں شہر کے وسائل اور سہولتوں میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہو جائے! اور یوں ان لوگوں کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو گا۔ بس ان لوگوں کے لیے لازم ہو گا کہ وہ زندگی کی سہولتوں میں اضافہ کرنے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر دیں۔ صرف اسی صورت میں وہ بڑھتی ہوئی آبادی کے چیلنج کا مقابلہ کر سکیں گے — پھر مجھے خیال آیا کہ جس طرح اس شہر کی آبادی بڑھ رہی ہے، ہمارے ملک کی آبادی بھی تو اسی طرح بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ہماری آبادی چار کروڑ تھی، ۱۹۷۱ء میں یہ ساڑھے چھ کروڑ ہو گئی اور اب اس کا اندازہ سات کروڑ سے اوپر کا ہے۔ اگر ہم نے ملکی وسائل کو بڑھانے کی کوشش نہ

گی، اگر ہم نے اِن مخفی ذخائر کا پتہ نہ چلایا جو ہنوز زمین کے سینے میں دفن ہیں، اگر ہم نے مزید محنت کر کے موجودہ سہولتوں میں اضافہ نہ کیا تو پورا ملک مزید مشکلات سے دوچار ہو جائے گا۔
مجھے گہری سوچ میں دیکھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔ "امجد! کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے عرض کیا۔ "سوچ رہا ہوں کہ اگر کسی ملک کے وسائل اور آبادی میں توازن برقرار نہ رہے تو قوموں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ شہر کی آبادی غیر متوازن ہو تو صحت، صفائی تعلیم، رہن سہن ہر شے متأثر ہو کر رہتی ہے۔ مدرسے کی آبادی میں توازن نہ رہے تو معیارِ تعلیم گر جاتا ہے اور اگر ملک کی آبادی وسائل سے بے نیاز ہو کر بڑھنے لگے تو پورا ملک اقتصادی زبوں حالی کا شکار ہو جاتا ہے؟"
ہیڈ ماسٹر صاحب نے فرمایا۔ "امجد تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں اس بات کی کوشش تو بہرحال کرنا چاہیے کہ ہمارے وسائل میں کم از کم اس رفتار سے اضافہ تو ضرور ہو جس رفتار سے آبادی بڑھ رہی ہے۔ بلکہ ہماری کوشش تو یہ ہونی چاہیے کہ وسائل میں پھیلاؤ کی رفتار آبادی میں اضافے کی رفتار سے کہیں زیادہ ہو تاکہ ہماری قوم خوشحال ہو اور لوگ سکھ چین سے زندگی بسر کریں۔

مشق

۱۔ ان سوالوں کے جواب دیجیے:۔
ا۔ اس کہانی کے مصنّف کو اپنا کمرۂ جماعت پہچاننے میں دِقّت کیوں پیش آئی؟
ب۔ پچیس تیس برس کے عرصہ میں مدرسے میں کون کون سی تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں؟
ج۔ اس کہانی میں جس شہر کا ذکر ہے اس کی آبادی کس طرح بڑھی؟ اور کون کون سے مسائل پیدا ہوئے؟
د۔ کسی ملک کے وسائل اور آبادی میں توازن برقرار نہ رہے تو اس کے کیا نتائج مرتّب ہوں گے؟
۲۔ جملوں میں استعمال کیجیے:۔ بلند و بالا۔ وسیع و عریض۔ فرطِ اشتیاق۔ مادرِ علمی۔ وجہِ سکون۔ باعثِ فرحت۔ اُدھیڑ بُن۔ خاطر خواہ۔
۳۔ معنی لکھیے:۔ اقتصادی زبوں حالی۔ غیر متوازن۔ فقدان۔ عہدِ رفتہ۔ مخفی ذخائر۔
۴۔ اعراب لگا کر تلفّظ واضح کیجیے:۔ معاشرہ۔ شناخت۔ اشتیاق۔ محترم۔ طالب علم۔ سبق۔ انتظام۔ متحمل۔
۵۔ "تک، ہی، میں، سے، کو" میں سے مناسب حرف لگا کر جملے مکمّل کیجیے:۔
ا۔ تمام لوگ چاند کی خاطر آسمان ...... دیکھ رہے تھے۔ ب۔ وہ اُردو ہمیشہ قلم ...... لکھتا ہے۔
ج۔ اس نے لاہور سے کراچی ...... سفر کیا۔ د۔ اس نے اس لفظ کے معنی لُغت ...... دیکھے۔

دُعا

یارب! مِرے وطن کو اِک ایسی بہار دے
جو سارے ایشیا کی فضا کو نکھار دے
یارب، مِرے وطن میں اِک ایسی ہوا چلا
جو اس کے رُخ سے گرد کے دھبّے اُتار دے
یارب، وہ اَبر بخش، کہ جو ارضِ پاک کو
حدِّ نظر تک اُمڈے ہُوئے سبزہ زار دے
میداں جو جل چکے ہیں، بجُھا اُن کی تشنگی
شاخیں جو لُٹ چکی ہیں، انھیں برگ وبار دے
ہر فرد میری قوم کا، اِک ایسا فرد ہو!
اپنی خوشی، وطن کی خوشی پر جو وار دے
یہ خطّۂ زمین معنون ہے تیرے نام
دے اس کو اپنی رحمتیں اور بے شمار دے

(احمد ندیم قاسمی)

مشق

۱ - اس دعا میں شاعر نے جس آرزو کا اظہار کیا ہے اس کا خلاصہ ایک پیرے کی صورت میں لکھیے۔

۲ - درج ذیل الفاظ اور تراکیب کے معنی بتائیے اور انھیں اپنے جُملوں میں استعمال کیجیے:
نکھار - حدّ نظر - ارض پاک - سبزہ زار ؛ تشنگی ؛ معنون ؛ برگ و بار ؛ بے شمار۔

۳ - اس نظم کے آخری تین اشعار کا مطلب اپنی کاپی میں درج کیجیے۔

تیار کردہ بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ۔ منظور شدہ محکمۂ تعلیم صوبہ بلوچستان بطور سول ٹیکسٹ بک برائے مدارس صوبہ بلوچستان بموجب نوٹیفکیشن نمبر 58 - 9356/II - EDN - 1/76 - 10 مورخہ 6 اکتوبر 1976ء

نظر ثانی شدہ: نیشنل ریویو کمیٹی، وفاقی وزارتِ تعلیم، حکومت پاکستان و پراونشل ریویو کمیٹی (اردو) بلوچستان

قومی ترانہ

پاک سَرزمین شاد باد   کِشورِ حَسین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان   ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد
پاک سَرزمین کا نظام   قُوّتِ اُخُوّتِ عوام
قوم، مُلک، سَلطَنت   پائندہ تابندہ باد
شاد باد مَنزلِ مُراد
پرچمِ ستارہ و ہلال   رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال   جانِ اِستِقبال
سایۂ خُدائے ذُوالجلال

کوڈ نمبر U VIII/89   سیریل نمبر

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	تعداد اشاعت	قیمت
اکتوبر 1980	اوّل	5000	5.75